فرحت اشتیاق

محبت ایک ساگر

مکمل ناول

وقت رخصت وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آئی تھیں۔

"بہت یاد آؤ گے تم۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بڑے اداس لہجے میں بولی تھیں۔

کل رات جب میں نے انہیں اپنے جانے کا بتایا تھا' وہ اس وقت بھی اسی طرح اداس اور دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں چمکتے ستاروں سے میں نے دانستہ نظریں چرالی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے انہیں الوداع کہا تو بے اختیار آگے بڑھ کر انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔" ان کے ہونٹوں کا پر شفقت لمس اور لہجے کی محبت بھری مٹھاس مجھے پھر اپنے حصار میں لینے لگی تھی۔ میں اس جگہ سے فوراً چلا جانا چاہتا تھا۔

یہ جگہ اور یہ لوگ مجھے کمزور کرنے لگے تھے۔ یہ طلسم کدہ ہمیشہ کی طرح پھر مجھے کسی جادوئی دنیا میں لے جانے لگا تھا۔ میں نے اکیس برس جس جذبے کی آبیاری کی' یہ اسے کچلنے لگا تھا۔ میں نے ایک آخری نظر اس گھر پر ڈالی جسے دیکھ کر میں نے بارہا سوچا تھا کہ کیا شداد کی جنت اس جنت سے زیادہ خوب صورت ہوگی اور وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔

"آپ نے جو بھی کیا ہو' مگر میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔" میرے آس پاس ایک روتی ہوئی آواز گونجی تھی اور کل سے اب تک یہ آواز بے شمار مرتبہ میری ساعتوں میں گونج چکی ہے۔ ہر بار یہ آواز مجھے کمزور کرنے لگتی ہے۔ میں ٹوٹنے لگتا ہوں۔

میرا دل چاہا' میں گاڑی واپس موڑ لوں۔ مگر دل کی اس خواہش کے برعکس میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آج کل کسی کا کوئی بھروسہ ہے۔ یہ دور جس میں ہم جی رہے ہیں ایسا نہیں ہے کہ کسی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرلیا جائے۔ پھپو! آپ سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہیں۔ سیدھا' سچا اور مخلص۔ ایک سے ایک

مکار اور چالباز لوگ پڑے ہیں دنیا میں، پتا نہیں یہ بھی کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ آپ سے اس نے میٹھی میٹھی باتیں کریں اور آپ اس پر فوراً ایمان لے آئیں۔ پتا نہیں کیا ارادے ہیں اس کے۔ کیا پتا ہمیں اکیلا سمجھ کر کسی بری نیت سے آیا ہو۔" ہانیہ پھپھو کے برابر میں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بڑے پر تشویش انداز میں بولی۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں بڑے اطمینان سے مسکرا دیں۔

"تم خود ہی تو کہتی رہتی تھیں کہ پھپھو انیکسی کتنی ویران لگتی ہے۔ مجھے تو رات کے وقت اس طرف جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں انیکسی کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ اب جب میں نے تمہاری بات مان لی ہے تم تب بھی خوش نہیں ہو۔" وہ جتنی پریشان اور مضطرب تھی پھپھو اسی قدر سکون سے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ہاں تو میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ کسی بالکل ہی انجان توی کو کرائے پر دے دیں۔ ہم کسی جان پہچان والی فیملی کو بھی تو انیکسی کرائے پر دے سکتے تھے۔"

"زمانہ کتنا خراب ہے' اکیلی عورتوں کے لیے تو خاص طور پر' پتا نہیں کوئی واردات یا نہ ہو۔ سوچا ہوگا' اتنے بڑے عالیشان مکان میں صرف دو اکیلی عورتیں ہی تو رہتی ہیں۔"

"تمہارے جملے میں گرامر کی غلطی ہے۔ یا تو دو عورتیں ہوں گی یا اکیلی عورت۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ دو بھی ہوں اور اکیلی بھی۔" وہ قطعاً غیر سنجیدہ تھیں۔

"پھپھو! میں بہت سیریس ہوں۔" وہ منہ بنا کر بولی اور وہ اس کے منہ بنانے پر ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"تمہاری سنجیدگی کا پتا تو تمہارے اس "زمانہ کتنا خراب ہے" سے ہی چل گیا تھا۔" اس کی ناراض شکل پر نظر پڑی تو وہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

"ہانی ڈارلنگ! میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں اگر میں اس قابل بھی نہیں ہو سکی ہوں کہ لوگوں کو پرکھ سکوں تو میرے زندگی پر سوائے افسوس کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے کوئی مجبوری نہیں جو وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے رام کرتا۔ سیدھی اور سچی بات تو یہ کہ مجھے وہ خود ہی بہت اچھا لگا تھا۔ تمہیں میں نے بتایا تھا نا اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اتفاق سے وہ وہاں سے جا رہا تھا اور اس نے مجھے لفٹ دے دی۔ اسلام آباد سے ایبٹ آباد تک میں نے اس کے ساتھ سفر کیا ہے۔ اس نے تو ایسی کوئی بات کی بھی نہیں تھی۔ بقول تمہارے کہ ہمارا عالیشان گھر دیکھ لیا ہوگا یا اکیلی عورتوں کو دیکھ کر کوئی واردات کرنا چاہتا ہے تو یہ تو بالکل ہی فضول بات ہے۔ اس نے اس وقت نہ تو ہمارا گھر دیکھا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ یہاں صرف ہم دونوں رہتے ہیں۔ وہ تو یہاں اپنی چھٹیاں گزارنے آیا ہے۔ کراچی میں اس کا اپنا ٹھیک ٹھاک بزنس ہے۔ تم نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے اس لیے اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہی ہو۔ بہت پڑھا لکھا' ویل مینرڈ اور خاصا امیر ہے۔ اسے ہم سے نہ تو کوئی لالچ ہو سکتا ہے نہ دشمنی۔ تمہاری تمام سوچیں ایک دم لغو ہیں۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ وہ اپنے کام کی تھکن اتارنے یہاں آیا ہے اور دو ماہ یہاں مکمل ریسٹ کرے گا۔ کسی ہوٹل وغیرہ میں وہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اس کا ارادہ تھا کہ کہیں کوئی گھر وغیرہ دو ماہ کے لیے کرائے پر لے کر وہاں رہے گا۔ اس کا ارادہ جان کر میں نے اسے آفر کر دی جس کا تم بتنگڑ بنا رہی ہو۔"

پھپھو کے سمجھانے پر وہ خاموش تو ہو گئی تھی مگر اس کا دل ابھی بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہاں ان دونوں کے علاوہ صرف ملازمین تھے جو بابا کے زمانے کے اور بہت ہی قابل بھروسہ تھے۔ بابا نے آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل یہیں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ان کا آبائی مکان تھا جسے پہلے انہوں نے کرائے پر دے رکھا تھا۔

ہانیہ کی ماما کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا' اسے پھپھو نے پالا تھا وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں ادھر

شوہر کی وفات کے بعد اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر بھائی کے پاس آ گئی تھیں۔ آرمی میں ہونے کی وجہ سے بابا کی پوسٹنگز بہت ہوا کرتی تھیں یہی وجہ تھی کہ بڑی کلاسز میں آنے کے بعد اس کی تمام ایجوکیشن ہوسٹلز میں ہوئی تھی۔ عدنان اور صفی بھی اسی کی طرح ہوسٹلز میں رہے تھے۔ عدنان اس سے کافی بڑا تھا جبکہ صفی تقریباً اسی کا ہم عمر تھا۔ عدنان کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ جانے کا ایسا خبط سوار ہوا کہ پھر نہ تو اسے پھپھو کے آنسو روک سکے اور نہ ہی بابا کا بڑا اصرار۔ وہ سب کو چھوڑ کر ایسا گیا کہ پھر وہیں کا ہو گیا۔ کبھی کبھار خط' فون اور پیسے بھیجنے کے علاوہ وہ ان لوگوں سے بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔

کتنا دکھ ہوا تھا پھپھو کو بیٹے کے اس رویے پر' مگر وہ بڑی صابر تھیں یہاں تک کہ بیٹے نے وہاں خود ہی اپنی پسند سے شادی کر لی وہ تب بھی خاموش رہیں۔ ہانیہ کا ایم ایس سی مکمل ہو گیا تو وہ بابا اور پھپھو کے پاس ایبٹ آباد آ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ بابا اچانک ہی ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور ان کے جانے کے بعد ابھی وہ دونوں پھپھو بھتیجی خود کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہی تھیں کہ صفی نے بھی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں یہاں ٹکے ٹکے کی نوکری کے لیے خوار نہیں ہو سکتا۔ بی ای کی ڈگری ہاتھ میں لیے میں جہاں آج کھڑا ہوں' آج سے دس سال بعد بھی یہیں کھڑا نظر آؤں گا اگر پاکستان میں رہا تو۔"

پھپھو کی منت سماجت ہانیہ کا سمجھانا سب بے کار ثابت ہوا تھا اور یوں وہ دونوں یہاں اکیلی رہ گئی تھیں۔ اپنے اس آبائی مکان اور بابا کی یادوں کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بابا اتنا کچھ چھوڑ کے گئے تھے کہ وہ اور پھپھو بغیر کسی سہارے کے بہت اچھی طرح زندگی گزار سکتی تھیں۔ مگر یوں خالی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا اسے بالکل پسند نہ تھا۔ پھپھو خود بھی آرٹس گریجویٹ تھیں اور انہیں تھوڑا بہت پڑھانے کا تجربہ بھی تھا۔ مل بیٹھ کر ان دونوں نے ایک اسکول بنانے کا پروگرام طے کیا۔ اس طرح جہاں پھپھو کا دھیان بیٹوں کی بے وفائی کی طرف سے ہٹ گیا وہیں ہانیہ کو بھی اپنی صلاحیتیں منوانے کا موقع میسر آ گیا۔ اب تو ان کے اسکول کو بنے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور ان دونوں کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا کہ اسکول بہت اچھا چل رہا تھا۔ زندگی بڑی پرسکون اور ہموار گزر رہی تھی کہ پھپھو نے اچانک انیکسی کرائے پر دینے کا مسئلہ اٹھایا۔ گو وہ خود بھی کافی عرصے سے یہی چاہ رہی تھی مگر اس طرح نہیں۔ اسے پھپھو کی ہر کسی پر جلدی اعتبار کر لینے کی عادت سے شدید اختلاف تھا۔ بہرحال جو بھی تھا اب تو وہ آ گیا تھا اس کی ناپسندیدگی کے باوجود۔

ان کا گھر بہت بڑا تھا۔ عدنان ہوتا اس کے بیوی بچے ہوتے' صفی ہوتا تو یہ گھر اتنا ویران تو نہ لگتا' وہ اکثر دکھ سے سوچا کرتی تھی۔ ان دونوں کے لیے تو وہ گھر ہی ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ انیکسی کا تو سوال ہی کیا تھا۔

بابا کی زندگی میں ان کے مہمان وہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ بہت دوست نواز اور ملنسار تھے۔ مگر اب تو وہ حصہ برسوں سے ویران پڑا تھا۔ تین کمروں' اٹیچڈ باتھ اور ایک کچن پر مشتمل وہ انیکسی مکمل طور پر آراستہ تھی۔ انیکسی میں آنے کے لیے الگ گیٹ اور علیحدہ پورچ بھی بنا ہوا تھا اس لیے کرائے پر دینے کے لیے پرائیویسی وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے روز وہ اسکول سے واپس آئی تو پھپھو گھر پر موجود نہیں تھیں۔ وہ اس سے پہلے ہی گھر واپس آ چکی تھیں اور گل بی بی کی اطلاع کے مطابق وہ نئے کرائے دار کا حال احوال دریافت کرنے گئی تھیں۔ وہ گل بی بی سے کھانا لگوا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی پھپھو کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا پھپھو! آپ بھی جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ مجھے اتنی شدید بھوک لگ رہی تھی۔" پھپھو کو آتا دیکھ کر وہ فوراً

بولی۔
"بس تو کھڑے کھڑے ہی تھی کہ چلو پوچھ آؤں اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ مگر اس نے بٹھا لیا تو باتوں میں وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

ہانیہ ان کی بات پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ ہاں البتہ اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ پھپو کیونکہ خود اچھی ہیں اس لیے انہیں دنیا کا ہر آدمی اچھا لگتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ جہاں سب بہت ایمان دار مخلص اور پیار کرنے والے ہیں۔

لاکھ وہ خود کو چھپا کر رکھتی تھیں مگر بیٹوں کی یاد میں جس طرح وہ بے قرار رہتی تھیں وہ اس سے پوشیدہ تو نہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس شخص میں انہیں عدنان یا صفی جیسی کوئی بات نظر آئی ہوگی اور ان کا دل ایک دم اس کی طرف مائل ہو گیا ہوگا۔

رات کے کھانے کے لیے پھپو نے خوب اہتمام کیا تھا۔ گل بی بی کے ساتھ مل کر وہ خوشی خوشی کھانا پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔

"پھپو! اس طرح تو لڑکیاں اپنے سسرالیوں کے لیے اہتمام کرتی ہیں۔" وہ انہیں چھیڑ رہی تھی۔

تمام چیزیں تیار ہو گئیں تو وہ ہانیہ کے پاس آکر لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔ ٹی وی دیکھنے کے دوران انہوں نے کئی دفعہ دروازے کی طرف اور کئی مرتبہ گھڑی کی طرف دیکھا مگر وہ جس کا انتظار تھا آکر نہیں دے رہا تھا۔

"پھپو! آپ کے مہمان تو ابھی تک نہیں آئے۔" اس نے گھڑی پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ گھڑی پونے دس بجا رہی تھی۔

"ہاں مجھے بھی حیرت ہو رہی ہے وہ آیا کیوں نہیں۔" اسے جواب دیتے دیتے انہوں نے گل بی بی کو آواز لگائی۔

"جاؤ تیمور صاحب کو دیکھو جا کر۔ ان سے کہنا کھانے پر ہم لوگ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔" ان کا پیغام سنتے ہی وہ فوراً گردن ہلاتی ہوئی روانہ ہو گئی تھی۔

تقریباً آٹھ دس منٹ بعد گل بی بی کی واپسی ہوئی تھی۔ اسے اکیلا آتا دیکھ کر پھپو کو حیرت ہوئی تھی۔

"میں نے اتنی زور زور سے دروازہ پیٹا کہ مردہ بھی ہو تو جاگ جائے۔ میرا خیال ہے وہ اندر ہیں ہی نہیں۔ ساری بتیاں بھی بند ہیں۔ ویسے گاڑی تو ان کی کھڑی ہوئی ہے۔ شاید کہیں پیدل چلے گئے ہوں گے۔" وہ تفصیلی خطاب کے موڈ میں تھی۔

اس کا جواب سنتے ہی پھپو کا چہرہ ایک دم افسردہ سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے کتنی چاہت سے انوائیٹ کیا تھا۔ کتنے اہتمام سے تمام چیزیں تیار کی تھیں اور وہ..... پھپو کو اداس دیکھ کر وہ جو پہلے ہی گل بی بی کا جواب سن کر غصے میں بیٹھی تھی مزید تپ گئی۔

"آپ کو بھی تو شوق ہے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے پر خلوص کے ٹوکرے نچھاور کرنے کا۔ ہائے اکیلا بچہ ہے۔ ابھی تو صحیح سے سیٹ بھی نہیں ہے کیا کھائے گا۔ چاہے بچہ چالیس پینتالیس سال کا مجیم شحیم مرد ہی کیوں نہ ہو وہ ہائے میرا بچہ ہوگا۔ ٹھیک ہے انیکسی کرائے پر دے دی اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کوئی نہ کوئی رشتہ بھی ضرور استوار کیا جائے سیدھا سیدھا ایک مکان دار اور کرایہ دار کے جیسے تعلقات رکھنے چاہیے تھے۔ دیکھ لیا اپنے خلوص کا انجام بچے نے آنا تو درکنار معذرت کرنا بھی گوارا نہ کیا۔" وہ نان اسٹاپ بولنے میں مصروف تھی اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ پھپو اسے اشارے سے پیچھے کیا دیکھنے کو کہہ رہی ہیں۔ وہ ان کے اشاروں کنایوں سے قطع نظر اپنی بات مکمل کر کے ہی چپ ہوئی تھی۔

"السلام و علیکم۔" اپنے پیچھے سے ابھرتی اس مردانہ آواز کو سن کر وہ بے ساختگی میں مڑی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" پھپو اس کے سلام کا جواب دیتی صوفے پر سے اٹھ چکی تھیں۔ گل بی بی کھڑی دانت نکالتی کبھی اسے اور کبھی نووارد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر آتے وقت دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی اور کھلے دروازے پر دستک دیتا وہ اندر آگیا تھا۔ پھپو اور گل بی بی دونوں ہی نے اسے دیکھ لیا تھا مگر ہانیہ اپنی پشت اس طرف ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ پائی تھی۔

"آئی ایم سوری' آپ لوگوں کو میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے آنکھ لگ گئی اور میں ایسا غافل ہوا کہ ابھی دروازہ بجنے کی آواز سے ہی جاگا ہوں۔" وہ پھپو سے مخاطب تھا اور پھپو کچھ دیر پہلے کی کوفت بھلائے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھیں۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! زحمت کیسی۔ آؤ اب مزید دیر کیے بغیر کھانا کھا لیا جائے۔" وہ پر خلوص انداز میں مخاطب تھیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئیں اور اس سے بولیں۔

"ارے میں تم لوگوں کا تعارف کروانا تو بھول ہی گئی۔ یہ ہانیہ ہے میری بھتیجی ایم ایس سی کیا ہے اس نے اپلائیڈ فزکس میں۔ یہ بھی میرے ساتھ اسکول میں ہوتی ہے اور ہانیہ یہ تیمور سجاد ہے۔ باقی اپنا تفصیلی تعارف یہ خود ہی کروائے گا۔"

وہ اپنی کچھ دیر پہلے کی باتوں پر شرمندہ تھی اس لیے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکی۔ اپنی اس حرکت پر بعد میں پھپو سے بھی ایک عدد لیکچر سننا پڑے گا یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ نہ بدتمیز تھی نہ منہ پھٹ مگر اس نئے بندے پر وہ اپنا کچھ ایسا ہی امپریشن ڈال چکی تھی۔

کھانے کی میز پر پھپو اور تیمور ہی باتیں کر رہے تھے جبکہ وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ چپکے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے مطمئن انداز میں پھپو سے باتیں کرتا نظر آیا۔ ایسا لگ تو نہیں رہا تھا کہ اس نے کوئی بات مائنڈ کی ہے۔ یا پھر اسے اپنے تاثرات دوسروں سے چھپا لینے میں کمال حاصل تھا۔ کھانے کے بعد وہ بجائے ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کافی پینے کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

اب اپنا بیٹھنا یا زبردستی اس سے باتیں کرنا ہانیہ کو بڑا آکورڈ لگ رہا تھا ایسے جیسے وہ اس کی خوشامد یا چاپلوسی کرنے کی کوشش کر رہی ہے یا اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے بچھ رہی ہے۔

"میں نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ اب اس کا جو دل چاہے سوچے۔ بلاوجہ کی چاپلوسی مجھ سے نہیں ہوتی۔" اس نے خود کو اطمینان دلایا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر اس کی توقع کے عین مطابق پھپھو نے اسے اخلاقیات پر ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے سے شروع ہوتا یہ ایک گھنٹہ طویل لیکچر بابا کی مہمان نوازیوں کے چیدہ چیدہ واقعات پر جا کر ختم ہوا تھا۔ اور وہ کیونکہ اس بات کے لیے تیار تھی اس لیے بڑے صبر سے تمام باتیں سنی تھیں۔

رات میں سونے کے لیے کمرے میں آئی تو حسب عادت کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ بابا کی وفات کے بعد سے وہ بہت ڈرپوک اور بزدل ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت عدم تحفظ کا احساس ستاتا تھا۔ مرد کا سہارا عورت کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ چاہے وہ باپ کی صورت میں ہو' بھائی ہو' شوہر ہو یا بیٹا۔ اسے اکثر اپنے بے سہارا اور اکیلے ہونے کا خیال رہتا تھا۔ وہ پھپھو سے ایسی کوئی بات کہتی تو نہیں تھی مگر اپنے اندر چھپائے اس خوف کو کبھی دور نہیں کر پائی تھی۔

اس کے برعکس پھپھو بڑی مضبوط' بہادر اور نڈر خاتون تھیں۔ وہ زندگی کے اتنے نشیب و فراز دیکھ چکی تھیں کہ انہیں کسی بات سے خوف نہیں آتا تھا۔ سونے سے پہلے تمام دروازے' کھڑکیاں وغیرہ وہ بڑے وہمی انداز میں دیکھا کرتی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر ایک گہری نگاہ ضرور ڈالا کرتی تھی۔

اس وقت جو وہ کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئی تو نظریں سیدھی انیکسی پر پڑی تھیں۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے ایک ہاتھ ریلنگ پر جمائے دوسرے سے اسموکنگ کرتا پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ انیکسی کے تینوں کمروں کے باہر چار فٹ چوڑی جگہ تھی۔ جسے بطور برآمدہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سامنے دو اسٹیپس جن پر بڑے خوب صورت سے گملے رکھے ہوئے تھے اور باقی اطراف میں گرل لگی ہوئی تھی۔

بانیہ کے کمرے اور برآمدے کی لائٹس آف تھیں' جبکہ انیکسی کی لائٹس آن تھیں۔

وہ بڑی گہری سوچ میں تھا۔ مسلسل ایک ہی زاویے سے کھڑا وہ سگریٹ کے کش لیتا اپنے گرد و پیش سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ کل تو وہ شرمندگی میں اسے صرف سرسری طور پر ہی دیکھ پائی تھی آج بغور دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ خاصا خوش شکل اور ہینڈسم ہے۔ اس کی پوری شخصیت میں سب سے خاص چیز اس کی آنکھیں ہیں۔ بانیہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ اپنے کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے دیکھے جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہ تھا اس لیے وہ بڑے آرام سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہلکی سبز اور بے حد گہری آنکھیں۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی چمک کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا اسرار تھا۔

جاگتے میں بھی سوتی ہیں
کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں

اس نے اپنی عادت کے عین مطابق فوراً ہی ان آنکھوں کے لیے یہ عنوان تجویز کیا تھا اس نے عالیہ کو جب بھی کسی کی آنکھیں' بال یا کوئی بھی چیز اچھی لگتی تھی وہ بعض کسی شعر کا مصرعہ یا نظم کی لائن بطور کیپشن ایک دوسرے کو سنا کر داد حاصل کیا کرتی تھی۔ کالج کی یہ عادت ایسی پختہ ہوتی تھی کہ وہ اب عالیہ کے بغیر بھی کسی میں کچھ مختلف دیکھتی تو فوراً کوئی شعر ڈھونڈ لاتی تھی اور پھر خود ہی اسے انجوائے کیا کرتی تھی۔ اپنی حرکت کے فضول ہونے کا احساس ہوا تو وہ فوراً ہی وہاں سے ہٹ گئی اور آہستگی سے کھڑکی بند کر کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

صبح وہ اور پھپھو دونوں ہی جلدی اٹھا کرتی تھیں۔ وہ نماز پڑھ کر باہر چہل قدمی کرتی تھی۔ اخبار آ جاتا تو باہر تازہ ہوا میں بیٹھ کر اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑاتی اور پھر اندر آ جاتی۔ جبکہ پھپھو اپنے نماز کے بعد کے وظائف اور تلاوت میں مشغول ہوتی تھیں۔ اسے صبح کا وقت بڑا اچھا لگتا تھا۔ گھاس پر ننگے پاؤں واک کرتی وہ خود کو بڑا فریش اور خوش محسوس کرتی تھی۔ یہ

دن بھر میں اس کا پسندیدہ ترین وقت تھا۔

مالی بابا سے سلام دعا کرتی وہ پورے باغ کا چکر لگا کر انتہائی حصے پر پہنچی تو برآمدے میں ایکسرسائز کرتے تیمور پر نظر پڑی۔ ٹریک سوٹ پہنے وہ ایکسرسائز کرنے میں مصروف تھا۔ رات کے برعکس وہ کہیں کھویا ہوا نہیں تھا بلکہ اسے دیکھ چکا تھا اور نہ صرف یہ کہ دیکھ چکا تھا بلکہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر خیر سگالی کا مظاہرہ بھی کر چکا تھا۔ جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے اور سے ہاتھ ہلا کر وش کر کے ہاتھ اور وہ واپس مڑ گئی تھی۔

اسکول میں دن معمول کے مطابق ہی گزرا تھا۔ دوپہر میں کھانا کھا کر پھپھو تو سونے لیٹ گئیں جبکہ وہ اپنے دو روز پہلے لگائے پودوں کا جائزہ لینے لان میں آ گئی۔ کمرے کی کھڑکی سے دیکھ کر وہ پہلے ہی مطمئن ہو چکی تھی کہ تیمور کی گاڑی نہیں کھڑی یعنی وہ موجود نہیں اس لیے بے دھڑک کھرپی وغیرہ اٹھائے یہاں آ گئی تھی۔ اس حصے میں اس نے موسم کی سبزیاں اور اپنے پسندیدہ پھول لگائے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ سے لگائے پودے بڑھ بھی جاتے تھے اس لیے اس کا شوق اور بھی بڑھ گیا تھا۔

"لگتا ہے' گارڈننگ سے آپ کو بہت دلچسپی ہے۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا بول رہا تھا اور بانیہ اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی۔ وہ اس کے خوف زدہ چہرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ شاید ڈر گئیں۔" انداز ایسا تھا جیسے اس کے ڈرنے پر اسے بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

"ڈری تو نہیں تھی۔ اصل میں آپ کی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔ میں سمجھی کہ شاید آپ نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایک دم آپ کی آواز سن کر چونک گئی تھی۔" مٹی میں اٹے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتی ہوئی کھڑی ہوئی اور وہ ایک دم مسکرا دیا۔ پتا نہیں کیوں اس کی مسکراہٹ بانیہ کو طنزیہ محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا تو یہ اہتمام رات کے کھانے کے لیے ہے۔" وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر رکھی باسکٹ میں بھری سبزیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"جی ہاں مجھے اور پھپھو دونوں ہی کو سبزیاں گوشت وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ پسند ہیں اور پھر گھر کی سبزیوں کا تو مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔" وہ باسکٹ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے بھی سبزیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔" وہ بھی مسکراہٹ دباتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

وہ اس کی بات کا مطلب سمجھے بغیر گردن ہلاتے آگے بڑھ گئی تھی۔ اندر جانے کے لیے کچن کی بیک پر بھی ایک دروازہ تھا جو برآمدے ہی میں کھلتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"اور گھر کی اگی سبزیاں تو میں نے آج تک کبھی نہیں کھائیں۔ گھر کی سبزیوں کا وہ الگ قسم کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟" بانیہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ چہرے پر بڑی شریر سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا اس کی بات کا مطلب سمجھ میں آیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"آپ کا یہاں سے جو بھی سبزی توڑنے کا دل چاہے' آپ توڑ کر پکا لیں اور الگ قسم کے مزے سے لطف اندوز ہوں' مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اسے جواب دیتی وہ جھپاک سے اندر گھس گئی تھی۔ اندر آ کر بھی کتنی دیر تک اسے ہنسی آتی رہی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

بانیہ اور حمرہ ڈرائیور کے ساتھ بازار آئی تھیں۔ حمرہ کو اپنی کچھ شاپنگ کرنی تھی اور بانیہ کو وہ زبردستی ساتھ لے آئی تھی۔ گاڑی سے اتر کر دکانوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی اچانک تیمور پر نظر پڑی وہ گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں محسوس کرتے ہوئے حمرہ نے بھی اسی طرف دیکھا تھا۔

"کون ہے یہ اسمارٹ بندہ۔"

"تیمور ہے۔ اسے ہی ہم نے انیکسی کرائے پر دی ہے۔" وہ اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ تیمور کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائی تھی۔

تیمور نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ مگر نہ تو اس کی

مسکراہٹ کے جواب میں مسکرایا تھا اور نہ ہی ہائے ہیلو کی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑے ہی ناقابل فہم اور عجیب و غریب تاثرات رقم تھے۔ آنکھوں میں کرختگی اور اجنبیت' جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔

"گڈ لکنگ ہونے کے ساتھ ساتھ بندہ تھوڑا' تھوڑا پراؤڈ بھی ہے یعنی ایک دم تمہاری پسند کے عین مطابق۔" حمزہ مسخرے پن سے بولی۔ جبکہ وہ اس کے اجنبی انداز پر خود ہی بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

حمزہ کے ساتھ باتوں میں لگ کر وہ وقتی طور پر اس بات کو بھول گئی تھی۔ ان دونوں کے پاس کرنے کے لیے ڈھیر ساری باتیں ہوتی تھیں۔ حمزہ بھی ان ہی کے اسکول میں شوقیہ ملازمت کر رہی تھی۔ روزانہ ہی وہاں ملتی تھیں مگر باتوں کے خزانے میں کبھی بھی کمی واقع نہ ہوتی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"صبح بخیر۔" وہ اپنے روٹین کے مطابق واک کر رہی تھی' جب اس نے تیمور کی آواز سنی۔ اسے گیٹ سے اندر داخل ہوتا وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی اور دیکھ کر بغیر کوئی تاثر دیے آگے بڑھ گئی تھی' وہ شاید باہر سے جوگنگ کرتا ہوا آیا تھا۔

"صبح بخیر۔" بغیر مسکراہٹ چہرے پر لائے خشک سے انداز میں کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔

"آپ روزانہ صبح جلدی اٹھتی ہیں؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

"جی۔" وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی۔

اس کے اس طرح ساتھ چلنے پر اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ لہلہاتے درختوں اور ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتا اس طرح چل رہا تھا جیسے یہ اس کا روز کا معمول ہے۔ ہانیہ کا دل چاہا کہ اسے کوئی سخت سا جملہ کہہ دے مگر خود پر ضبط کرتی چپ ہی رہی۔

"فرائی ڈے کو رات گئے تک میں بلاوے کا منتظر ہی رہا۔ بائی دا وے وہ سبزیاں کیسی بنی تھیں؟" وہ بڑے دوستانہ انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

خان لالہ کو اخبار اٹھاتا دیکھ کر وہ جلدی سے "اچھی بنی تھیں۔" کہتی ان کی طرف چلی آئی تھی۔ ان کے ہاتھ سے اخبار لے کر ربڑبینڈ اتارتی وہ سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگی۔ دو تین منٹ بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

"ہوں گے کہیں کے نواب' جب دل چاہے گا بات کر لیں گے جب دل چاہے گا پہچاننے سے ہی انکار کر دیں گے۔" وہ چڑچڑے پن سے سوچتی اندر آ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

گل بی بی نے اسے تیمور کے آنے کا بتایا تو وہ اس کی آمد کی وجہ سوچتی لاؤنج میں آ گئی تھی۔

"پھپھو تو گھر پر نہیں ہیں۔" سلام دعا کے بعد اس نے اگلی بات یہی کہی تھی۔

"کوئی بات نہیں' آپ تو ہیں ناں۔" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کر مجبوراً ہانیہ کو سامنے والے صوفے پر بیٹھنا پڑا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھی اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ ظاہر ہے جب آیا ہے تو آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہو گی۔

"فرمائیے کیسے آنا ہوا۔" جب دو تین منٹ یونہی خاموشی سے گزر گئے تو وہ بالآخر تنگ آ کر بولی۔

"چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا اور کیونکہ مجھ سے چائے بالکل اچھی نہیں بنتی اس لیے سوچا کہ کیوں نہ آپ کے ہاں بن بلایا مہمان بنا جائے۔" وہ بڑے سکون سے بولا۔

نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیے وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بات سن کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اس قسم کی بے تکلفی کی امید کم از کم وہ اس شخص سے ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتی پھپھو کو دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس بے حد مشکل بندے کو وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

تیمور کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ اب تمہیں دوبارہ بلانے کے لیے باقاعدہ دعوت دینی پڑے گی۔ تب ہی آؤ

گے۔" وہ گرم جوشی سے بولی تھیں۔ "ہانی! تم نے تیمور کی کچھ خاطر مدارت بھی کی یا خالی خولی باتوں پر ٹرخایا ہے۔"

"جی پھپھو! میں بس گل بی بی سے چائے کا کہنے ہی والی تھی۔" وہ ایک دم وضاحتی انداز میں بولی۔

"گل بی بی سے نہیں تم خود بنا کر لاؤ۔" انہوں نے اعتراض کیا تھا۔ اسے پتا تھا چائے کے ساتھ پھپھو ڈھیر سارا اہتمام بھی چاہتی ہیں اس لیے مزید کچھ کہے بغیر کچن میں آگئی تھی۔

ٹرالی خوب اچھی طرح بھر کر اس نے گل بی بی کے ہاتھ روانہ کی اور خود اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

تیمور کو گاڑی اندر لاتا دیکھ کر وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

"بات سنیں۔" اس نے دور سے آواز دی تو اسے رکنا پڑا۔ گاڑی بند کر کے من گلاس اتارتا ہوا وہ اس کے پاس آگیا۔

"میں نے تو صرف انیکسی کرائے پر لی ہے۔ یہ پورشن تو پورا آپ کا ہے۔ یہاں آنے کے لیے آپ میری غیر موجودگی کو کیوں ضروری سمجھتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ آپ کا گھر ہے آپ جس وقت اور جب چاہیں یہاں آسکتی ہیں۔ اس پر میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ اپنے گھر میں کہیں آنے جانے کے لیے مجھے کسی کی اجازت درکار نہیں۔" وہ جواب دے کر واپس مڑنے لگی تو وہ فوراً ہی بولا۔

"آئیں میرے ساتھ ایک کپ کافی پئیں۔"

"شکریہ میں کافی نہیں پیتی۔" وہ اس کی دعوت کے جواب میں بولی۔

"اچھا چائے؟" اس نے بے ساختہ کہا۔

"بدمزہ چائے پینے کا مجھے تو کوئی شوق نہیں۔" وہ بڑی بے مروتی سے بولی۔

"چلیں کولڈ ڈرنک، آئس کریم کچھ بھی۔" وہ اصرار کر رہا تھا۔

"آپ مجھے بلانے پر اتنا بضد کیوں ہیں؟" اس نے کچھ تعجب سے اور کچھ چڑ کر پوچھا۔

"اور آپ انکار پر اتنی بضد کیوں ہیں؟" وہ بغیر جواب میں کچھ کہے کندھے اچکاتی اس کے ساتھ انیکسی کی طرف آگئی تھی۔

"آئیں بیٹھیں۔" اسے کمرے میں بٹھا کر وہ دوبارہ باہر نکل گیا۔

سامنے شیلف میں لگی کتب دیکھ کر اسے اس کے باذوق ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر شیلف کے پاس آگئی تھی اور بغور اس کا کلیکشن دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تو اس نے کتاب واپس شیلف میں رکھ دی اور خود بھی آکر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس نے ایک کپ اس کے ہاتھ میں پکڑایا تھا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گیا۔

"آپ کے پاس بہت اچھی کتابیں ہیں۔" وہ آئس کریم کھاتے ہوئے بولی۔

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے گھر میں جو اسٹڈی ہے وہاں ہے میرا قیمتی اور اصل کلیکشن۔" وہ فخریہ انداز میں بولا۔

"آپ نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کراچی یونیورسٹی سے ہی کیا ہے؟" وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولی۔

"جی۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"کراچی میں کس جگہ رہتے ہیں آپ؟" اس نے دوبارہ سوال پوچھا۔

"یقین کریں میں مسز شیراز کو دو مہینوں کا ایڈوانس کرایہ پہلے ہی دے چکا ہوں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ اس کی بات قطعاً نہیں سمجھی تھی جبکہ وہ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں شرارت لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کوئی مطلب نہیں۔ آپ اپنا انٹرویو جاری رکھیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

"آپ کے خیال سے میں آپ کا انٹرویو کر رہی تھی۔" وہ اس کی زچ کرتی مسکراہٹ سے چڑ کر بولی۔

"مجھے تو ایسا ہی لگا جیسے میرا انٹرویو ہو رہا ہے اور یقین کریں مجھے انٹرویو دینے کا بہت شوق ہے۔ پوچھیں آپ کو جو بھی پوچھنا ہے۔" وہ ہنوز شرارت کے موڈ میں تھا۔

"کچھ نہیں پوچھنا مجھے۔" وہ آئس کریم کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے ناراضی سے بولی۔

"دیکھیں ابھی تو آپ نے بہت سے بنیادی سوال نہیں پوچھے مثلاً یہ کہ میں کہاں پیدا ہوا' کیوں پیدا ہوا' کہاں پڑھا کیوں پڑھا' میرا پسندیدہ رنگ' خوشبو' شعر' میرا ستارہ وغیرہ وغیرہ۔" وہ اسے مسلسل چڑا رہا تھا اور وہ واقعی چڑ گئی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"یہ لیں۔" وہ شیلف میں سے وہی کتاب نکال لایا تھا جو وہ ابھی دیکھ رہی تھی۔ اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر وہ فوراً بولا۔

"لے لیجیے یہ گفٹ نہیں ہے۔ پڑھ کر مجھے فوراً واپس کر دیجیے گا۔" ہانیہ نے کچھ سوچ کر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"آپ ناراض ہو کر تو نہیں جا رہیں؟" وہ اس کے ساتھ دروازے تک آتے ہوئے بولا۔

"آپ بہت عجیب آدمی ہیں۔ کم سے کم میں تو آپ کو نہیں سمجھ پائی۔ پہلے خود ہی الٹی سیدھی فضول باتیں کرتے ہیں اور پھر معصوم بن کر پوچھتے ہیں ناراض تو نہیں۔" وہ منہ بنا کر انداز میں بولی اور وہ اس کے انداز پر ہنس پڑا۔

"چلیں میں ایکسکیوز کر رہا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔" وہ بڑے آرام سے اپنی غلطی مانتا ہوا معذرت کر رہا تھا۔

"بہت ہی مشکل بندہ ہے یہ۔" اپنے پورشن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "میں کراچی میں رہائش کا کیا اس وجہ سے پوچھ رہی تھی کہ کہیں وہ کرایہ دیے بغیر فرار نہ ہو جائے۔" اس کی بات ہانیہ کی سمجھ میں اب آئی تھی۔ "لیکن مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہے۔ کتنا ذہین ہے۔ اس کی حس مزاح عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے۔ اس کی باتیں ایک دم سمجھ میں نہیں آتیں۔" وہ اس کے بارے میں مختلف باتیں سوچنے میں مصروف تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"میں ذرا تیمور کی خیریت معلوم کر آؤں۔" پھپھو نے ذرائی فروٹس کھاتی ہانیہ کو مخاطب کیا۔

"کیوں انہیں کیا ہوا؟" پلیٹ میں سے کاجو چنتے ہوئے وہ بولی۔

"کل بھی سارا دن گھر پر رہا اور آج بھی صبح سے کہیں نہیں گیا۔ خدانخواستہ طبیعت خراب نہ ہو۔" وہ فکرمندی سے کہنے لگیں۔

"اوفو پھپھو آپ بھی بس حد کرتی ہیں۔ وہ بھی کہیں گئے یا آتے میرے پیچھے پڑے ہیں۔ بھئی کہیں باہر نہیں گیا میری مرضی انہیں کیا تکلیف ہے۔"

"وہ اتنا بدتمیز نہیں ہے۔" پھپھو اس کی بات پر خفگی سے کہتی دروازے کی سمت بڑھ گئیں۔ وہ وہیں صوفے پر لیٹے لیٹے سو گئی تھی۔ چلتا ہوا ٹی وی بھی گل بی بی نے آکر بند کیا تھا۔ اذان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔

"پھپھو ابھی تک نہیں آئیں؟" اس نے گل بی بی سے بڑے تعجب سے پوچھا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے واپس لاؤنج میں آئی اسی وقت پھپھو بھی اندر داخل ہوئی تھیں۔

"اچھا ہوا میں چلی گئی۔ بے چارہ شدید بیمار ہے۔" اس کے استفسار پر وہ بولیں۔

"طبیعت خرابی میں اٹھنے کو بھی کہاں دل چاہتا ہے۔ صبح سے بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ ایسے ساتھ رہنے کا فائدہ کہ بندہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی کام نہ آئے۔" انہیں اپنے اتنی دیر سے جانے پر بڑا افسوس تھا۔

"میں نے دودھ بنایا دوا کھلائی پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی رہی تاکہ اس کا دل بہل جائے۔" وہ مٹا

بھرے انداز میں بولی تھیں۔

"چلیں جنت میں آپ کا ایک عدد محل بن گیا۔" وہ شرارتی انداز میں بولی۔

وہ اس کی بات پر ہنستی ہوئی کچن میں چلی گئی تھیں پھر رات میں وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے سوپ اور کھانا تیار کر کے ٹرے میں لگا کر خود ہی لے کر گئی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ دروازے پر دستک دینے کے بعد اب تھوڑی سی ہچکچا بھی رہی تھی۔ "پتا نہیں مجھے آنا چاہیے تھا یا نہیں۔" دروازے کھلنے سے پہلے تک وہ کئی بار یہی بات سوچ چکی تھی۔

وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا تولیہ ہیڈ پر اچھالتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"زہے نصیب' آیئے تشریف لایئے۔" وہ اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیتا ہوا شوخی سے بولا۔

"میں آپ کی کتاب واپس کرنے آئی تھی۔" وہ کتاب اس کی طرف بڑھائے سنجیدگی سے کھڑی تھی۔

"صبح صبح نہار منہ کتاب واپس کرنے کا بہت شکریہ۔ ویسے گل بی بی کیا آج کل چھٹیوں پر ہیں؟" وہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر روکتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

اسے اچانک اپنے اس طرح آنے پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ کوئی اتنے خاص بیمار بھی نہیں لگ رہے موصوف۔ بلاوجہ پھپھو نے شور مچایا ہوا تھا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ واپس مڑی۔

"ارے اتنی جلدی۔ بیٹھیے نا۔" وہ اصرار کرنے لگا۔ "اور ابھی تو آپ کے محل کی صرف بنیادیں ہی ڈالی گئی ہوں گی۔" وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کا دل اپنے معمول سے ہٹ کر اچانک تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

"یقین کریں میں واقعی بہت بیمار ہوں۔ ابھی بھی سوڈگری سینٹی گریڈ بخار ہو رہا ہے۔" وہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہانیہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے خود کو زبردستی پُر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اپنے عین سامنے بیٹھے تیمور سجاد کو دیکھا تو وہ مکمل طور پر اپنی ہی جانب متوجہ نظر آیا۔

"کل تو مجھے اس قدر تیز بخار تھا کہ میرے اوپر رکھ کر چائے کا پانی ابالا جا سکتا تھا۔ مسز شیراز بھی میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔" وہ مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے ہوا بولا۔

"آپ پھپھو کو مسز شیراز کیوں کہتے ہیں؟" بڑی دیر کے بعد اسے بولنے کے لیے کچھ نہ کچھ سوجھ ہی گیا تھا۔

"میرا مطلب ہے' وہ آپ سے اتنا پیار کرتی ہیں آپ کو اپنا بیٹا کہتی ہیں اور آپ اتنے فارمل طریقے سے انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ کتنی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اس طرح بولنے میں۔"

"پھر کیا کہا کروں جس سے اجنبیت کا احساس نہ ہو۔" وہ الٹا پوچھنے لگا تھا۔

"آپ انہیں آنٹی کہہ سکتے ہیں یا جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔ مسز شیراز سے تو — ہر نامحرم اچھا ہو گا۔" وہ بالکل اسی طرح بولی تھی جیسے اسکول میں بچوں کو کوئی بات سمجھاتے ہوئے بولتی تھی۔

"اور آپ کو کیا کہا کروں۔ میرا مطلب ہے جس سے اجنبیت کا احساس نہ ہو۔" وہی اسے زچ کر دینے والی مسکراہٹ اس نے چہرے پر سجائی ہوئی تھی۔

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔" وہ حسب عادت چڑ گئی تھی۔

"پھر بھی ہانیہ 'ہانی بہنی کیا کہا کروں۔"

"مس ہانیہ محمود۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

"اتنا لمبا نام۔ ابھی میں آپ کا نام لے ہی لے رہا ہوں گا اور آپ ایبٹ آباد سے پشاور پہنچ چکی ہوں گی۔" اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے

بجائے وہ حیرت سے تکیے کے نیچے سے جھانکتے ہوئے ریوالور کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ اپنے پاس ریوالور رکھتے ہیں۔" وہ پہلے ہی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ چکا تھا کہ وہ کس چیز کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہے۔

"جی' ویسے اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے۔ اپنی حفاظت کے لیے بے شمار لوگ اپنے پاس ریوالورز رکھتے ہیں۔" وہ مطمئن انداز میں بولا تھا۔

پھپھو کو ناشتے کی ٹرے اٹھا کر اندر آتا دیکھ کر وہ دونوں ہی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ پہلے ہی ان دونوں کو بیٹھا ہوا دیکھ چکی تھیں۔ ہانیہ نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ انہیں آتا دیکھ کر تیمور نے جلدی سے آگے بڑھ کر ریوالور بیڈ کی سائڈ ٹیبل میں ڈال دیا تھا۔

"آنٹی! میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا۔ پلیز یہ تکلف مت کیا کریں مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور ویسے بھی اب تو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔" ہانیہ اس کے منہ سے آنٹی سن کر مسکرا دی تھی جبکہ پھپھو نے اس بدلے ہوئے طرز تخاطب پر کچھ خوش اور کچھ حیران نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"کچھ اتنا خاص نہیں بنایا میں نے جسے تکلف کہا جائے اور یہ تم اتنی ٹھنڈ میں صبح صبح نہائے کیوں؟" وہ فکر مندی سے کہتی ٹیبل پر ناشتہ لگانے لگی تھیں۔

"میں اپنا ناشتہ بھی یہیں لے آئی تھی۔ میں نے سوچا ہم دونوں مل کر ناشتہ کریں گے۔" وہ ٹرے خالی کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔

"ہانی تمہارا ناشتہ میں ٹیبل پر لگا کر آئی ہوں۔" وہ گردن ہلاتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"یہ تیمور کو اپنے پاس ریوالور رکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ یہاں اس کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ ایبٹ آباد آیا بھی فرسٹ ٹائم ہے۔" ناشتے کے دوران اور پھر اسکول کے لیے تیار ہوتے وقت وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی' اور اس کے سامنے میں کتنی اسٹوپڈ حرکتیں کرنے لگتی ہوں بالکل کسی سولہ سالہ لڑکی کی طرح بی ہیو کرتی ہوں۔ اسے دیکھنے چلی ہی گئی تھی تو کتاب والی بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے اپنے آپ کو خود ہی ڈانٹا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"یار! تو شروع ہی سے لکی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہینڈسم کزن اور کرائے دار ملا تو وہ بھی دل بھر کر ہینڈسم اور گڈ لکنگ ہے۔" حمرہ کی اس فضول بکواس پر اس نے فائل سے نظریں اٹھا کر اسے خفگی سے دیکھا تھا۔ اسکول میں فائنل ایگزامز کے بعد رزلٹ تیار ہونے کی گہما گہمی چل رہی تھی اور وہ دونوں ہی اس میں بری طرح مصروف تھیں۔

"بے تکی باتیں کرنے کے علاوہ تمہیں کوئی اور کام ہے؟"

"اس میں بے تکی کیا بات ہے۔ میں تو صرف تمہاری قسمت پر رشک کر رہی ہوں۔ ویسے سچ سچ بتاؤ چکر کیا ہے۔ آنٹی بھی ہر وقت تیمور تیمور کرتی نظر آتی ہیں اور تمہارے تیور بھی مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔" وہ شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔

"حمرہ تم پٹو گی مجھ سے۔" وہ غرائی اور حمرہ اس کے ناراض ہونے کا کوئی نوٹس لیے بغیر بڑے آرام سے چیونگم چباتی رہی۔

"ویسے اگر ایسا کچھ ہو جائے تو کوئی مضائقہ تو نہیں۔ مجھے تو وہ بندہ بے حد اچھا لگا ہے۔" اسے پیپر ویٹ اٹھاتا دیکھ کر وہ ممکنہ حملے سے بچنے کی خاطر سر نیچے کرتی ہوئی "سوری" کرنے لگی تھی۔

"بہت بے ہودہ ہو گئی ہو۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ فضول بکواس کرتی اس حمرہ صدیقی نے ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی تھی۔" اس کی ناراضی کے خیال سے وہ چپ تو ہو گئی تھی مگر آنکھوں میں شوخی اور شرارت ابھی تک موجود تھی۔

"حمرہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہر بات میں اسے کوئی نہ کوئی چکر نظر آتا ہے۔ بیوقوف نہ ہو تو۔" رات سونے کے لیے لیٹی تو حمرہ کی باتوں پر اس نے یہی سوچا تھا۔

اتوار کے روز وہ اور پھپھو ناشتہ بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے۔ روزانہ اسکول وقت پر پہنچنے کی افراتفری میں ناشتے کے نام پر بس ایک رسم ہی ادا کی جاتی تھی۔ آج بھی اتوار ہونے کی وجہ سے پھپھو حلوہ پوری ساتھ آلو چھولوں کا سالن اور بھنا ہوا قیمہ بنا رہی تھیں۔

"پھپھو اور کتنی دیر لگے گی۔" وہ پانچویں دفعہ ان سے یہی بات پوچھ رہی تھی۔ اسے پھپھو سے لاڈ اٹھوانے میں بہت مزہ آتا تھا اور چھٹی والے دن تو وہ بالکل بچوں کی طرح ان سے ضدیں کیا کرتی تھی۔ اپنی پسند کے کھانے پکواتی تھی۔

"بس تھوڑی دیر اور لگے گی۔" سوجی بھونتے ہوئے انہوں نے بڑے مصروف انداز میں کہا۔ گل بی بی پوریوں کا آٹا گوندھ چکی تھی اور اب ٹرے میں چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر رکھ رہی تھی۔

"سب چیزیں تقریباً تیار ہیں۔ ایسا کرو تم تیمور کو بھی بلا لاؤ۔ پھر گرم گرم پوریاں تلوں گی۔" پھپھو کی بات پر وہ کرسی سے اٹھ گئی پھر کچھ خیال آنے پر ایک دم رک گئی۔

"ہو سکتا ہے وہ ناشتہ کر چکے ہوں۔"

"تم کہہ تو آؤ اگر کر چکا ہوگا تو کوئی بات نہیں۔" ان کا جواب سن کر وہ باہر نکل گئی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

"آپ نے ناشتہ کر لیا یا ابھی کریں گے۔" سلام دعا کے بعد اس نے فوراً اپنے کام کی بات پوچھی۔

"آپ اندر تو آجائیں۔" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر بولا۔

"نہیں میں بیٹھنے نہیں آئی۔ پھپھو نے آپ کو ہمارے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت بھیجی ہے۔ اگر آپ نے اب تک ناشتہ نہیں کیا تو فوراً آجائیں اور پھپھو کے ہاتھ کے بنے حلوہ پوری کے ناشتے سے لطف اندوز ہوں۔"

"ناشتے کی دعوت اور وہ بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کو۔" اس کی بات کے جواب میں وہ زبردستی حیرت کا مظاہرہ کرتا ہوا بولا۔

"اسے اتنی پرانی بات اب تک یاد ہے۔" ہانیہ ایک پل کے لیے ذرا شرمندہ سی ہو گئی پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"دعوت پھپھو نے دی ہے۔ میں نے تو صرف پیغام پہنچایا ہے۔ پھر آپ آ رہے ہیں؟" وہ واپسی کے لیے پر تول رہی تھی۔

"ہاں آپ چلیں میں آتا ہوں۔ بس ذرا باتھ لینا ہے دس منٹ لگیں گے۔" وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر آئرن اسٹینڈ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"خیال رکھیے گا کہیں ایسا نہ ہو ہمیں حلوہ پوری کے ناشتے کے بجائے حلوہ پوری لنچ کرنا پڑے۔" اپنا بدلہ چکا کر وہ بڑے مطمئن انداز میں اندر آئی تھی۔ استری آن کر کے ہینگر سے اپنی بلو کلر کی شرٹ اتارتا تیمور اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔

"لائیں میں استری کر دوں۔" وہ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تھینک یو میں کر لوں گا۔" اس نے انکار کر دیا۔

"خوامخواہ دیر ہو جائے گی۔ آپ نہانے جائیں میں استری کر کے شرٹ یہاں رکھ جاؤں گی۔" وہ دوبارہ بضد ہوئی۔

"مجھے اپنا کام خود کرنے کی عادت ہے اور ویسے بھی مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگے گی۔" اس کے اصرار کے جواب میں اس نے سختی سے منع کر دیا تھا اور استری کرنی شروع کر دی۔

وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر واپس آگئی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق دس منٹ بعد آگیا تھا اور وہ جو کچھ دیر پہلے حلوہ پوری کے ناشتے کے لیے بڑی بے تاب تھی اب بیٹھی بے دلی سے لقمے لے رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ بس اتنا سا کھایا ہے تم نے۔" تیمور کی پلیٹ میں قیمہ ڈالتے ہوئے انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا جو پلیٹ ایک طرف کھسکا کر چائے کے سپ لے رہی تھی۔

"شور تو اتنا مچا رہی تھیں کہ پھپھو اس سنڈے کو حلوہ پوری ہونی چاہیے اور کھایا کیا ہے۔" وہ ناراضی سے بولی تھیں۔ تیمور خاموشی سے دونوں کے مکالمے سنتا ناشتہ کر رہا تھا۔

"پھپھو! میں مہمان تو نہیں ہوں۔ ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ جب بھوک لگے گی تو کھا لوں گی۔" وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے ٹیبل سے اٹھ گئی۔

ناشتے کے بعد بھی تیمور کافی دیر تک بیٹھا پھپھو کے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ باہر لان چیئر پر بیٹھی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ تیمور کو لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا دیکھ کر اس نے اخبار مزید پھیلا کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

"اخبار پڑھ چکیں تو ذرا ٹیکسی میں آئیے گا۔" ہانیہ نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے پاس کھڑا وہ بڑی بردباری سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنے اگلے ہفتے پہننے والے تمام کپڑے استری کروانے ہیں۔ جوتے پالش کروانے ہیں۔ باتھ روم دھلوانا ہے۔ کمرے کی ڈسٹنگ کروانی ہے اور دو چار ایسے ہی چھوٹے موٹے کام اور بھی کروانے ہیں۔" اس کی رگوں میں دوڑتے خون نے ایک دم جوش مارا اخبار ٹیبل پر پٹخ کر وہ بڑے جاہ و جلال اور غصے سے اسے گھور رہی تھی جبکہ وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز مسکراتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا اتنی اچھی ٹیکسی کرائے پر لینے کے ساتھ ساتھ مجھے ایک عدد ماسی بھی مفت میں مل گئی ہے۔" باوجود غصے کے اسے بے ساختہ ہنسی آگئی اور اسے ہنستا دیکھ کر وہ بڑے سکون سے مسکراتا ہوا اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

"اتنی چھوٹی سی بات پر اتنا شدید غصہ۔" وہ تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے آپ کا بات کرنے کا اسٹائل بہت برا لگا تھا۔" وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

"سوری۔" اس نے جھٹ معذرت کی۔

"ویسے یہ آج پتا چلا ہے غصہ کسی بھی بات پر ہو، اترتا بے چارے کھانے ہی پر ہے۔" ہانیہ اس کی بات پر ایک دم جھینپ گئی۔

"شاباش جا کر اچھے بچوں کی طرح ناشتہ کریں۔ آپ کا فرمائشی حلوہ پوری کا ناشتہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" وہ بزرگانہ انداز میں بولا۔

"ویسے آپ اتنے برے نہیں ہیں جتنا برا میں سمجھتی تھی۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ اس روز بازار میں آپ نے مجھے یقیناً پہچانا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے چادر اور عینک کی وجہ سے آپ پہچان نہ پائے ہوں اور میں سمجھی آپ نے جان بوجھ کر مجھے اگنور کیا ہے۔" ہانیہ کی بات پر وہ مسکرا دیا۔

"شکر ہے آپ نے میرے بارے میں آخر کار اچھی رائے قائم کر ہی لی۔"

"پتا ہے جب پھپھو نے آپ کو ٹیکسی کرائے پر دی تھی تو میں نے بہت اعتراض کیا تھا۔ اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں کون ہے کیسا ہے ہمیں کسی انجان آدمی کو رکھنا چاہیے یا نہیں۔ آپ کے بارے میں میرے دل میں بہت سے وسوسے تھے۔" وہ اس کے چہرے پر پھیلتے تاثرات سے بے نیاز بولنے میں مصروف تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات در آئے تھے۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ ایک دم کرسی پر سے اٹھ گیا۔ ہانیہ اس کے اس طرح اچانک اٹھ جانے پر حیرت زدہ تھی۔

"ایسی تو میں نے کوئی بات نہیں کی ہو سکتا ہے اسے کوئی کام یاد آگیا ہو۔" وہ خود کو اطمینان دلاتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ لاؤنج کی صفائی کرتی گل بی بی نے اس کے ہاتھ میں لا کر ایک نوٹ پکڑایا تھا۔ "کرسی کے پاس پڑا تھا یہ نوٹ۔ پتا نہیں کس ملک کا ہے۔" وہ نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر چلی گئی تھیں۔ آسٹریلین ڈالر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ان کے جاننے والوں میں دور دور تک ایسا کوئی نہیں تھا جو آسٹریلیا میں رہتا ہو۔ پھر یہ نوٹ کہاں سے آگیا۔ اس نے نوٹ پھپھو کو

کہا تو وہ بھی حیران ہوئی تھیں۔ پچھلے دو تین روز سے کہیں کوئی مہمان بھی نہیں آیا تھا۔

"تیمور کے علاوہ تو کوئی آیا ہی نہیں۔" پھپھو نے کہا۔

"ہو سکتا ہے انہیں مختلف ملکوں کی کرنسی جمع کرنے کا شوق ہو۔ اب کی دفعہ ملیں گے تو میں پوچھوں گی۔" بانیہ نے ان سے کہا اور وہ جواب میں گردن ہلا کر خاموش ہو گئی تھیں۔

پھپھو کو کسی شادی میں جانا تھا۔ گل بی بی شادیوں میں جانے کی شوقین بانیہ کے انکار پر فوراً ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ دونوں چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تو وہ ٹی وی دیکھتی رہی پھر جب بوریت ہونی شروع ہوئی تو ٹی وی بند کر کے اٹھ گئی۔

"یہاں نہ کچھ بنایا جائے۔" وہ خود سے کہتی کچن میں آ گئی تھی۔ ڈونٹس کی ٹرے اوون سے نکالتے ہوئے وہ بڑی خوش تھی۔ آج بہت دنوں بعد کچھ بیک کیا تھا اس لیے کونشیس تھی مگر چکھ کر دیکھنے پر اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈونٹس ٹھیک ٹھاک بنے ہیں۔ پھپھو اور گل بی بی کے لیے الگ سے تھوڑے سے نکال کر رکھنے کے بعد اس نے ٹرے کو المونیم فوائل سے کور کیا اور ہاتھوں سے کپڑوں کی شکنیں دور کرتی کچن کا پیچھے والا دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل آئی۔ باہر گھن گرج کے ساتھ زوردار بارش ہو رہی تھی۔

یہاں کے موسم اور بارشوں کی عادی ہونے کے باوجود اسے بادلوں کے گرجنے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جلدی سے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ انیکسی کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ انیکسی پوری اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تیمور نے لائٹس کیوں نہیں آن کیں۔ اوہ آئی سی یقیناً اس دن کی طرح گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہے ہوں گے۔" وہ مسکراتی ہوئی اس کے کمرے کے پاس آئی تو دروازہ ادھ کھلا نظر آیا۔

تمام لائٹس آف تھیں صرف بیڈ سائڈ میں رکھا لیمپ روشن تھا۔ اسے کمرے کا ماحول بڑا ڈراؤنا محسوس ہوا۔ راکنگ چیئر پر جھولتا وہ موبائل پر کسی سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز سن کر بانیہ کا دستک دینے کے لیے بڑھتا ہوا ہاتھ بے ساختہ رک گیا تھا۔

"کسی کا بیٹا نہیں میں۔" وہ پھنکارا تھا۔ اس کے لہجے کی سختی بانیہ کو اندر تک ہلا گئی تھی۔ "جتنا دل چاہے اپنی حفاظت کا انتظام کر لو میں پھر بھی تمہیں مار ڈالوں گا۔ ابھی تو میں اس چوہے بلی کے کھیل کو انجوائے کر رہا ہوں۔ جس وقت کھیل ختم کرنا ہو گا تمہیں بتا کر آؤں گا۔ اور مجھے کوئی روک نہیں پائے گا۔ مار ڈالوں گا' میں تمہیں مار ڈالوں گا۔" بولتے بولتے اسے پتا نہیں کیا احساس ہوا تھا کہ ایک دم گردن موڑ کر دیکھا تھا اور وہ جو اتنی خوفناک باتیں سن کر دھک سے رہ گئی تھی اسے موبائل بند کر کے دور اچھالتے اور پھر راکنگ چیئر سے اٹھتے دیکھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ الٹے قدموں وہاں سے بھاگی تھی مگر ایک قدم ہی آگے بڑھی ہو گی کہ اسے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹا گیا تھا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی تھی۔ بارش اور بادلوں کی گھن گرج میں اس کے چیخنے کی آواز خان لالہ تک پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔ وہ اسے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا تھا۔ کمرے میں لا کر اس نے اسے ایک زوردار جھٹکے سے چھوڑ دیا وہ اوندھے منہ کارپٹ پر گری تھی۔ دروازے کو لاک کر کے اس نے کھڑکی بھی بند کر دی۔ اسے کھڑکی اور دروازہ بند کرتے دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے ایک ایک قدم اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کا دل خوف سے بند ہونے لگا۔

یہ وہ تیمور تو نہیں تھا جو نرم اور شیریں لہجے میں اس سے گفتگو کیا کرتا تھا جس کی آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اپنے لیے بڑی خاص اور انوکھی سی چمک دیکھی تھی۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری کرخت چہرہ اور آنکھوں میں انتہائی خوفناک تاثر۔ وہ بے اختیار پیچھے کی طرف کھسکنے لگی تھی۔

"تیمور! پلیز مجھے جانے دیں۔"

اس کی کمر دیوار سے ٹکرائی تھی۔ خود کو اس سے بچانے کے لیے وہ مزید پیچھے نہیں جا سکتی تھی جبکہ وہ چہرے پر خوف ناک سی چمک لیے ایک ایک قدم سکون سے اٹھاتا اس کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا سنا ہے تم نے۔" اس کا ٹھنڈا برف جیسا لہجہ اس کے جسم سے جان نکال رہا تھا۔

"کچھ نہیں سنا میں نے۔ بائی گاڈ میں نے کچھ نہیں سنا۔" وہ روتے ہوئے چلائی۔ "مجھے جانے دیں۔ پلیز مجھے جانے دیں۔" سخت سردی میں وہ پوری کی پوری پسینے میں نہا گئی تھی۔

"جو کچھ سنا ہے اگر کسی سے کہا تو یاد رکھنا جو ایک قتل کر سکتا ہے وہ دو تین چار پانچ کتنے بھی قتل کر سکتا ہے۔" وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر غرایا۔ اس کے ہاتھوں کی آہنی گرفت اس کے جسم و جاں میں درد کی شدید لہر دوڑا گئی تھی۔

شدید تکلیف اور خوف کے مارے وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بول پائی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے بس کسی بھی لمحے قتل کر ڈالے گا۔ اس نے زور سے چلا کر خان لالہ کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کی مگر وہ اس کا ارادہ بھانپ کر پہلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھے رہا تھا یہاں تک کہ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ وہ بری طرح مچلتی خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی کوششیں تو کیا کامیاب ہوتیں' البتہ اس نے خود ہی ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہٹاتے ہی بانیہ نے دوبارہ چلانے کی کوشش کی تو اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

"میں تمہیں جانے دے رہا ہوں بانیہ محمود! لیکن اگر تم نے پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی یا کسی اور کو اس بارے میں کچھ بتایا تو تمہاری اور تمہاری عزیز از جان پھپھو کی زندگی کی میرے پاس کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن اگر کوئی میرے راستے میں آیا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں از اٹ کلیئر؟" وہ سرد و سفاک لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ تھپڑ کی تکلیف بھلائے دیوانہ وار بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی تھی۔ تیمور سکون سے کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ دروازے کا لاک کھول کر وہ اندھا دھند باہر بھاگی۔ کتنے سارے ڈونٹس اس کے پیروں کے نیچے آئے تھے۔ اس کا دوپٹہ جو تیمور کے گھسیٹ کر اندر لے جانے پر باہر برآمدے میں گر گیا تھا ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ وہ سب چیزوں کو نظر انداز کرتی اندر آ گئی تھی۔ پھپھو اور گل بی بی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

اس کا دل چاہا خان لالہ کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لے۔ ان سے کہے مجھے بچا لو' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پورے گھر میں سناٹا تھا اور وہ اکیلی' لاؤنج کا دروازہ شاید ہوا سے بجا تھا مگر وہ خوف کے مارے چیخ اٹھی تھی۔ اسی وقت بادلوں کی خوفناک گرج کی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اپنے سرہانے بیٹھی پھپھو کو دیکھ کر بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ بڑے پر تشویش انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیسی ہو میری جان۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولیں۔

"پھپھو مجھے چھپا لیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

"ڈرتے نہیں ہیں۔ بیٹا ہم سب ہیں تمہارے پاس' ڈرنے کی کیا بات ہے۔" وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "ساری رات میں اور تیمور تمہارے لیے کتنا پریشان رہے ہیں۔ پورے

دس گھنٹوں بعد تمہیں ہوش آیا ہے۔" اس نے ایک دم ڈر کر ان کی گود سے سر اٹھایا تھا اور نظریں سیدھی سامنے کرسی پر بیٹھے تیمور پر پڑی تھیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا سب ایک دم یاد آگیا تھا۔

"کیا ہوا ہانی!" اسے دوبارہ ہاتھ پاؤں چھوڑتا دیکھ کر وہ رو پڑی تھیں۔

"بابا! مجھے بچا لیں۔ بابا! آپ کہاں ہیں؟" بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے منہ سے نکلے سرگوشی نما یہ جملے ان دونوں ہی نے سن لیے تھے۔ اسے دوبارہ ہوش آیا تو پھپھو اکیلی اس کے بیٹھی تسبیح کے دانے گراتی مسلسل دعاؤں میں مصروف تھیں۔ ان کے ہاتھ سے ناشتہ کر کے وہ چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی۔

"پتا نہیں مجھے کیا ہوا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔" بہت دقت کے استفسار کے جواب میں وہ نظریں جھکا کر بولی تھی۔

وہ ظہر کی نماز پڑھنے ہی کے لیے اس کے پاس سے اٹھی تھیں ورنہ صبح سے یہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تیمور کو کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتا دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو گئے تھے۔ بے جان ہوتے جسم کے ساتھ وہ خود کو اس قابل بھی محسوس نہیں کر رہی تھی کہ اٹھ ہی سکے۔

"کیسی طبیعت ہے؟" وہ اس وقت وہی تیمور تھا جس کا لہجہ شیریں ہوتا تھا اور جس کی نظروں میں بڑا نرم و ملائم سا تاثر ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کی سفید پڑتی رنگت دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

"ہانیہ پلیز! جو ہوا اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بلیوی میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں تکلیف دینے کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ کل رات جو کچھ ہوا' میں اس سب کے لیے معافی مانگ رہا ہوں۔" وہ ندامت سے سر جھکا کر بول رہا تھا۔

اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دونوں میں سے کسے صحیح سمجھے' کل رات والے تیمور کو جو بے حد بے رحم تھا یا اسے جو چہرے پر افسردگی اور ندامت لیے بیٹھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا تھا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔

شام تک اس کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ اس کی چپ تو نہیں ٹوٹی تھی مگر طبیعت کافی بہتر تھی۔ پھپھو نے رات بھر کی ٹینشن کے بعد اس وقت سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر جیسے جیسے رات ہونی شروع ہوئی اس کا خوف پھر عود آیا۔

"پھپھو! کہیں مت جائیں۔ میرے پاس بیٹھی رہیں۔" انہیں اٹھ کر جاتا دیکھ کر وہ خوف زدہ انداز میں بولی اور وہ اس کے متوحش انداز پر خوفزدہ بھی ہو گئیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ لان چیئر پر بیٹھی غیر دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سردی کی شدت میں اچانک ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے کہنے پر پھپھو اسے یہاں بٹھا کر خود نہانے چلی گئی تھیں۔ تیمور کو اس طرف آتا دیکھ کر کل کی طرح وہ بے ہوش تو نہیں ہوئی تھی' خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سے رنج اور ملال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اس کے چہرے پر نظر آتے دہشت اور بے اعتباری کے رنگ دیکھ کر وہ چپ سا ہو گیا تھا۔

"تیمور سجاد تمہیں کبھی بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پلیز خود کو ریلیکس رکھو۔ دیکھو تمہاری وجہ سے آنٹی بھی کتنی پریشان ہیں۔" وہ آہستگی سے لیکن مضبوط لہجے میں بولا۔

"آپ کون ہیں؟" اس کی بات کو نظر انداز کر کے

اس نے پوچھا۔

"یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ دیکھیں مزید جھوٹ مت بولیے گا ہم سے۔" وہ بے اعتباری سے اس کی طرف دیکھ کر ہذیانی انداز میں بولی تھی۔

"دیکھو میں جو بھی ہوں اور جہاں سے بھی آیا ہوں مگر تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرم لہجے میں بولا۔

"نقصان کا مطلب معلوم ہے آپ کو۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چلائی۔ "اگر معلوم ہوتا تو یہ بات کبھی نہ کہتے۔ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے میرا' آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ پھپھو نے آپ کو اپنا بنایا' آپ پر اعتبار کیا اور آپ انہیں دھوکا دیتے رہے' ان کے بھروسے کا خون کرتے رہے۔ کیا وہ زندگی میں دوبارہ کسی پر بھروسہ کر پائیں گی۔ بتائیں جواب دیں۔ وہ ٹوٹ جائیں گی۔ کیا اس نقصان کا ازالہ ہو سکتا ہے اور میں؟ آپ نے جو بھی کیا ہو مگر میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ ساری دنیا میں صرف یہی ایک شخص ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہوں۔ جس کے ساتھ ہونے پر میں اپنے سارے ڈر' سارے خوف بھول جاؤں گی۔" وہ روتے روتے گھاس پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ "اور نقصان کسے کہتے ہیں۔ کیا اس سے بڑا بھی کوئی نقصان ہو سکتا ہے۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے سرگوشیانہ بولی۔

"میں ہار گئی' میری محبت ہار گئی' پھپھو کا خلوص ہار گیا۔ نقصان تو ہو چکا۔" روتے روتے اس نے سر اٹھایا تو وہ پتا نہیں کب وہاں سے جا چکا تھا۔

پھپھو نے اسے رات میں نیند کی دوا کھلا کر سلا دیا تھا۔ اس کی کل کی خوفزدہ حالت کے پیش نظر انہوں نے ایسا ڈاکٹر کے مشورے پر کیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو پھپھو کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ وہ انہیں آوازیں دیتی نیچے آئی تو وہ نماز کی چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر انہوں نے اشارے سے پاس بلایا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ پھپھو کی آہستہ آواز میں کی جانے والی تلاوت۔ اس کے دل کو بڑا سکون پہنچا رہی تھی وہ تلاوت کر چکیں تو گل بی بی کو آواز دے کر بلایا۔

"ٹیکسی صاف کر کے سارے کمرے لاک کر دینا۔" اس کے ہاتھ میں چابیاں پکڑاتے ہوئے وہ افسردگی سے بولیں اس کی حیران شکل پر نظر پڑی تو بڑی اداسی سے بولیں۔

"تیمور چلا گیا ہے۔"

"چلے گئے؟" اس کے دل کو دھکا لگا تھا۔

"ہاں رات میرے پاس آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کسی بزنس پرابلم کی وجہ سے اسے فوراً واپس جانا پڑے گا۔ صبح فجر سے بھی پہلے چلا گیا۔ اب تک دل کو یقین نہیں آرہا کہ وہ چلا گیا ہے' کیسا اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا وہ۔" وہ اپنی آنکھوں کی نمی اس سے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھیں۔

وہ چپ چاپ گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھپھو قرآن شریف ہاتھ میں لیے وہاں سے اٹھیں تو وہ بھی بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی۔ ٹیکسی کی طرف آتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہاں ویرانی ڈیرا جمائے بیٹھی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ بیڈ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بستر کی چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آرہا تھا۔ آنسو ایک تواتر سے بہے چلے جا رہے تھے۔

"میں اس شخص کے لیے کبھی بھی نہیں روؤں گی۔ وہ جھوٹا تھا' قاتل تھا' اس نے ہمیں دھوکا دیا۔ ایسے آدمی کے لیے میں کبھی آنسو نہیں بہاؤں گی۔" وہ خود سے کہہ بھی رہی تھی اور روئے بھی جا رہی تھی۔ بک شیلف میں اس کی تمام کتابیں جوں کی توں موجود تھیں۔ اپنا باقی تمام سامان لے جانے کے باوجود وہ اپنی کتابیں یہیں چھوڑ گیا تھا۔

"لے لیجیے یہ گفٹ نہیں ہے۔ پڑھ کر مجھے فوراً واپس کر دیجیے گا۔" اسے لگا جیسے وہ کہیں پاس ہی کھڑا بول رہا ہے۔ وہ بک شیلف کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ سب سے اوپر والے خانے میں ترتیب سے

رکھی تمام کتابوں کے ساتھ ایک سفید رنگ کا لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے وہ لفافہ اٹھا کر کھولا۔

"ہانیہ! میں جا رہا ہوں۔ اب ہم زندگی میں دوبارہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تمہیں جو بھی تکلیفیں اور دکھ ملے ان سب کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں کون تھا کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا ہوں یہ سب بے معنی باتیں ہیں اور انہیں جان کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ تمہیں بے حساب خوشیاں ملیں کبھی کوئی دکھ تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے۔

صہیب ریاض

پورا خط اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ وہ بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہر دل میں شام غریباں اتر آئی تھی۔ اس کے دل کے ہر گوشے سے نوحوں' آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کیوں پھپھو! ہمارے ساتھ ہی ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہمیں اچھا لگنے والا ہر شخص ہمیں چھوڑ کر کیوں چلا جاتا ہے۔ پہلے ماما' پھر عدنان بھائی پھر پاپا' پھر صفی اور اب تیمور۔ کیوں پھپھو! کیوں اللہ کو ہم پر رحم کیوں نہیں آتا۔" وہ ان کی گود میں منہ چھپائے سسک رہی تھی اور اسے چپ کرانے کی کوشش میں وہ خود بدحال سی ہو گئی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آپ نے جو بھی کیا ہو مگر میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ ساری دنیا میں صرف یہی ایک شخص ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہوں۔"

رات کی تنہائی میں اکثر یہ روتی ہوئی آواز مجھے سوتے سے جگا دیتی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہوں ایک مانوس خوشبو اپنے چہار جانب بکھری محسوس ہوتی ہے اور پھر ساری رات یہ آواز مجھے سونے نہیں دیتی۔ کبھی روتی کبھی سسکتی یہ آواز مجھے پھر ای جنت میں پہنچا دیتی ہے جہاں سے میں بھاگ آیا تھا۔ کبھی کبھی یوں لگنے لگتا ہے جیسے میرا دل اب بھی وہیں اسی طلسم کدہ میں کہیں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ وہاں سے چلتے وقت اپنی سب سے قیمتی متاع اپنا دل شاید میں وہیں چھوڑ آیا تھا۔

"دل اور میں۔" میں خود کو تنبیہی انداز میں ٹوکتا ہوں۔ "میں صہیب ریاض ہوں اور یہ دل 'محبت' خلوص اور جذبات نامی چیزیں میرے لیے اتنی حقیر اور بے معنی ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔" خود کو کمزور پڑتا دیکھ کر میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتا ہوں' خود کو یاد دلاتا ہوں کہ میرے لیے دنیا میں سب سے اہم میری اپنی ذات ہے۔ میں صرف اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں۔ خود کو فائدہ پہنچانے کے لیے میں کسی کو بھی دھوکا دے سکتا ہوں' نقصان پہنچا سکتا ہوں اور خود کو نقصان پہنچانے والے سے انتقام لینے کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ مگر اس کے باوجود میری بے سکونی ختم نہیں ہوتی۔ کبھی میں گھنٹوں ساحل کنارے بیٹھ کر موجوں کو تکتا رہتا ہوں' کبھی ان وحشتوں سے تنگ آ کر آدھی رات کو اٹھ کر سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگتا ہوں۔

"مجھے کوئی نہیں ہرا سکتا۔ میں محبت کو نہیں مانتا۔ محبت انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے۔ میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔" میں چیخ اٹھتا ہوں۔

سب کہتے ہیں صہیب بدل گیا ہے۔ جب سے چٹیاں گزار کر آیا ہے پتا نہیں اسے کیا ہو گیا۔ یہ وہ صہیب ہی نہیں لگتا۔ بکواس کرتے ہیں سب۔ کوئی نہیں بدلا میں ویسا ہی تو ہوں۔ وہی صہیب ریاض جو ایک کامیاب بزنس مین ہے' جو کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا' جس کے پاس دولت' حیثیت' رتبہ' عالیشان مکان' قیمتی گاڑیاں سب کچھ ہے۔ جو دلوں سے کھیل کر سکون محسوس کرتا ہے۔ وہی ہوں میں' میں کبھی نہیں بدل سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔

آج سے اکتیس سال پہلے ایک بے حد امیر گھرانے میں' میں نے آنکھ کھولی تھی۔ میرے عالیشان کل نما گھر میں' میں ڈیڈی اور ممی رہا کرتے تھے۔ ڈیڈی کا بہت زیادہ لاڈلا تھا میں۔ ان کی جان تھی مجھ میں۔ آفس سے آ کر وہ جب تک مجھے نہ دیکھ لیتے انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔ ممی۔ پتا نہیں وہ ایسی کیوں تھیں۔ انہیں مجھ سے بالکل بھی محبت نہیں تھی۔

وہ خام ہاؤس سے بہت مختلف تھیں۔ مجھے نہیں یاد انہوں نے کبھی والہانہ انداز میں لپٹا کر مجھے پیار کیا ہو یا میری فکر کی ہو۔ میں بیمار بھی ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے میری طبیعت پوچھ کر اپنے فنکشنز میں چلی جاتی تھیں۔ میرے لیے گورنس اور نوکروں کی فوج موجود تھی۔ دنیا کی ہر آسائش مجھے حاصل تھی۔ شاید اگر ہم پاکستان میں رہتے تو میں ممی کی بے توجہی اور سرد انداز کو بہت شدت سے محسوس کرتا مگر دنیا کے جس خطے میں ہم رہ رہے تھے وہاں لوگ اپنے بچوں سے زیادہ پالتو کتوں سے پیار کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

اپنے اکلوتے اور دولت مند ہونے کے احساس نے مجھے بے حد مغرور' ضدی اور خود پسند بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ وہ ماحول تھا جو مجھے ملا' جہاں ہر کوئی مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ تم صہیب' ریاض' دوسروں سے بہت بلند اور اعلا ہو۔ ڈیڈی خاندانی رئیس تھے۔ دولت اور عیش و عشرت ہمیشہ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہی تھیں۔ ممی سے ان کی شادی بڑے زبردست قسم کے افیئر کے بعد ہوئی تھی۔

وہ پاکستان چھٹیاں گزارنے گئے اور وہاں انہیں شہلا عثمان ایسی بھا گئیں کہ پھر نہ انہوں نے ان کا چھوٹا سا تین کمروں کا مکان دیکھا اور نہ ان کے والد کی پرچون کی دکان۔ طبقاتی فرق ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکا تھا۔ شادی کے اتنے برسوں بعد بھی وہ ممی سے بے تحاشا محبت کرتے تھے۔ انہوں نے انہیں ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔

ممی دل کھول کر پیسہ خرچ کرتیں' اپنے دوستوں' فنکشنز اور پارٹیز میں مصروف رہتیں مگر وہ انہیں کچھ نہ کہتے۔ ڈیڈی کو بچوں کی بہت چاہ تھی مگر ممی میرے بعد مزید فیملی بڑھانے کے لیے تیار نہ ہوئی تھیں۔ وہ مجھے بھی اس دنیا میں لانے پر صرف ڈیڈی کی وجہ سے آمادہ ہوئی تھیں۔ انہیں مجھ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلکہ مجھ سے کیا مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ انہیں ڈیڈی سے بھی محبت نہیں ہے۔ وہ صرف خود سے محبت کرتی تھیں۔ اپنی فگر' اسمارٹنیس' اسکن اور بالوں پر وہ بے حد توجہ دیا کرتی تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھیں اور اپنے آپ پر اتنی زیادہ توجہ دے کر انہوں نے اپنی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ کر لیا تھا۔ ہم لوگ کسی بھی فنکشن میں ساتھ جاتے تو لوگ ممی اور ڈیڈی کو اکٹھا دیکھ کر بے ساختہ کہا کرتے تھے۔

"مسز ریاض تو ریاض صاحب سے چودہ پندرہ سال چھوٹی نظر آتی ہیں۔" اور ان کمنٹس پر ممی کا چہرہ خوشی سے جھلملانے لگتا تھا۔

مجھے پتا نہیں کیوں اس بات پر ان کا خوش ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ڈیڈی بھی کم خوب صورت تو نہیں تھے بس یہ تھا کہ بزنس کی الجھنوں میں لگ کر وہ خود سے کچھ لاپروا رہنے لگے تھے۔ ان کی کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے اور باقاعدگی سے ایکسرسائز نہ کرنے کی وجہ سے وہ تھوڑے فربہ ہو گئے تھے۔

وہ چاہتے تو بال ڈائی کر سکتے تھے۔ خود کو فٹ رکھ سکتے تھے اور میرا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسا کریں۔ میں چاہتا تھا کہ ہم کہیں جائیں تو ممی کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' سب انہیں نظر انداز کر دیں۔ سب کی نظریں بس ڈیڈی کا طواف کرتی رہیں مگر میں ڈیڈی سے یہ بات کبھی بھی نہیں کہہ سکا تھا۔

ممی صبح سو کر اٹھتیں تو پھر ان کا آدھا دن اپنی اسکن اور بالوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ باقی کا دن وہ شاپنگ کرنے اور اپنے دوستوں کے ساتھ ملنے ملانے میں گزارا کرتی تھیں۔ ان کے بہت سے دوست تھے جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ ڈیڈی

کو ان کی کسی ایکٹیوٹی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان دونوں کے بہت سے دوست مشترک بھی تھے۔ ہمارے گھر پر آئے دن گیٹ ٹوگیدرز ہوا کرتیں اور ممی ان میں خوب سج بن کر شرکت کرتیں۔ وہ ڈیڈی سے صرف دو سال چھوٹی تھیں مگر ان کے مقابلے میں وہ بہت ینگ اور فریش محسوس ہوتی تھیں۔

ان کی تیاریاں کسی نوعمر لڑکی کو مات دیتی تھیں۔ میں دس سال کا ہو گیا تھا۔ چھٹی کلاس میں پہنچ گیا تھا اور اپنی کلاس کا سب سے ذہین لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں جمیل اعجاز کی ہمارے گھر آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ ڈیڈی کے قریبی دوست اور بزنس میں ان کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔

ممی اور ڈیڈی کے بے شمار دوست تھے اور سب ہی کا ہمارے گھر آنا جانا رہا کرتا تھا' میں اس بات کا عادی تھا مگر جمیل اعجاز کے آنے میں جو بات مجھے سب سے زیادہ ناگوار گزرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ڈیڈی کی غیر موجودگی میں آیا کرتے تھے۔ جن دنوں ڈیڈی بزنس کے کام سے کہیں گئے ہوئے ہوتے ان دنوں جمیل اعجاز کا بیشتر وقت ہمارے گھر میں گزرا کرتا تھا۔ میں اسکول سے آتا تو پاتا وہ دونوں ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے یا کہیں ساتھ جانے کے لیے تیار ہوتے۔ ممی جو پہلے ہی خود کو بہت فٹ کر کے رکھا کرتی تھیں اب مزید اپنی تیاری پر توجہ دینے لگی تھیں۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں جمیل اعجاز کو کئی برسوں سے اپنے گھر آتا دیکھ رہا تھا اب اچانک وہ مجھے برے کیوں لگنے لگے تھے۔ میں اپنے احساسات کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں خود اپنے آپ کو ہی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر کون سی بات ہے جو مجھے اتنی بری لگ رہی ہے۔ کیا ممی کا بہت زیادہ تیار ہونا' جمیل اعجاز کے ساتھ گھومنا پھرنا یا مجھے پہلے سے بھی زیادہ نظرانداز کرنا۔

ممی رات گئے تک غائب رہتیں' میں کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا تو جمیل اعجاز کی گاڑی سے وہ مسکراتی ہوئی اتر رہی ہوتیں اور پتا نہیں کیوں ممی کو ان کے اتنے قریب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ مجھ پر عجیب سی جھنجھلاہٹ اور کوفت سوار رہنے لگی تھی۔ ڈیڈی کا وہی مصروف انداز تھا۔ کبھی ملبورن' کبھی لندن' کبھی بارسلونا اور کبھی ٹوکیو۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے اور پھر میری زندگی میں وہ قیامت کی رات آئی کہ جس نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک تبدیل کر دیا۔

آج جب وہ ساری باتیں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ شاید میں ایسا نہ ہوتا اگر میری زندگی میں وہ دو واقعات نہ ہوئے ہوتے۔ شاید پھر میں بھی ایک نارمل زندگی جی رہا ہوتا۔ وہ رات جس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے آج بھی اتنی ہی شرم آتی ہے جتنی برسوں پہلے۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگتی ہیں' ایسا لگتا ہے جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ میرا دل چاہتا ہے یا خود مر جاؤں یا اس عورت کو مار ڈالوں۔ میری رگوں میں دوڑتا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ ساری دنیا تہس نہس کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ "میں ڈیڈی کی طرح بے غیرت' بے حمیت اور بزدل نہیں۔" میں چیخ اٹھتا ہوں۔

میری نظروں کے سامنے میری اپنی سگی ماں ایک غیر مرد کے ساتھ انتہائی شرمناک حالت میں آجاتی ہے اور میں پاگل ہونے لگتا ہوں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ پھر اس رات کے بعد میں زندگی میں کبھی خوش نہیں رہ سکا۔ ایسا لگتا تھا میں جسمانی طور پر زندہ ہوں مگر میرا دل مر چکا ہے۔ ڈیڈی بزنس ٹرپ سے واپس آئے تو میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ میری بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک چپ تھی جو میرے لبوں پر جمی ہوئی تھی۔ پتا نہیں میں چپ کیوں ہو گیا تھا۔ میں نے ڈیڈی کو ساری بات بتائی کیوں نہیں تھی۔

وہ عورت میرے کمرے میں آتی تو میں نفرت سے منہ موڑ لیا کرتا تھا' میرا اس کی شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ڈیڈی کو ممی

ت لڑتے دیکھا۔ ان کے لڑنے کی آوازیں میرے کمرے تک آ رہی تھیں' ڈیڈی زور زور سے چیخ رہے تھے۔ جمیل اعجاز کا نام لے کر ممی سے پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے اور جواب میں وہ بھی چیخ رہی تھیں۔

ڈیڈی نے انہیں شاید تھپڑ مارا تھا اور اس کے بعد صرف ممی کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں ڈیڈی کہیں باہر چلے گئے تھے۔ پھر اس کے بعد بہت دنوں تک ان دونوں کی بات چیت بند رہی تھی۔ میں اس معاملے میں ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ممی ہاتھ باندھ کر روتی ہوئی ڈیڈی سے معافی مانگ رہی ہیں۔ ڈیڈی نے انہیں دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔

"چھوٹا آدمی ہمیشہ چھوٹا رہتا ہے۔ تم نیچ خاندان سے۔ اس قابل ہی نہ تھیں کہ تمہیں اپنے برابر جگہ دی جائے۔ دکھا دی ناں اپنی اصلیت۔"

ان کے لہجے میں حقارت تھی۔ وہ دونوں میری موجودگی فراموش کیے ہوئے تھے۔

"مجھے معاف کر دیں' آپ کو مجھ سے آئندہ کوئی شکایت نہیں ہوگی اور جمیل بھائی تو میرے لیے سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ پتا نہیں کس نے آپ کے کان بھر دیے ہیں۔ آپ کہیں تو میں اپنے بچے کی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میرا ان سے بھائی بہن کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں اور اگر آپ پسند نہیں کریں گے تو میں آئندہ ان سے نہیں ملا کروں گی۔" وہ روتے ہوئے بول رہی تھیں اور پھر ڈیڈی نے واقعی انہیں معاف کر دیا تھا۔

اپنی جائیداد میں سے جو کچھ ان کے نام کیا ہوا تھا وہ غصے میں آ کر واپس لے چکے تھے مگر اس معافی کے بعد انہوں نے سب چیزیں دوبارہ ان کے نام کر دیں۔

سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا مگر میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا میں ڈیڈی کو اس عورت کے بارے میں سب کچھ بتاؤں اور ان سے کہوں کہ اسے ہمارے گھر سے نکال دیں مگر کئی بار کوشش کے باوجود میں ان سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ جمیل اعجاز نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا تھا اور ممی بھی زیادہ وقت گھر پر گزارنے لگی تھیں۔

کرسمس کی چھٹیاں آئیں تو ہم لوگ گھومنے کے لیے اٹلی گئے۔ اس ٹور کا پروگرام ممی نے ڈیڈی کے بہت پیچھے لگ کر بنوایا تھا۔ وینس کے مارکو پولو ایئرپورٹ پر جمیل اعجاز کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں ایسا لگا جیسے وہ خود کو انجان ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کر رہا ہے' اسے یقیناً ہمارے یہاں آنے کا پہلے سے پتا تھا۔ میں نے ڈیڈی کی طرف دیکھا تو ناگواری والے تاثرات تو ان کے چہرے پر بھی نظر آئے مگر وہ پتا نہیں کیوں اس کی موجودگی برداشت کر رہے تھے۔ وہ ڈیڈی کے بزنس میں چالیس پرسنٹ کا شیئر ہولڈر تھا۔ شاید وہ اسی لیے اس سے تعلقات میں بگاڑ نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ڈیڈی سے باتیں کر رہا تھا اور ڈیڈی رسمی انداز میں اس کی باتوں کے جواب دے رہے تھے۔ وہ سارا دن ہم لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ وینس سے واپس روم ہم لوگ بائی کار آئے تھے۔ ڈیڈی رات کے وقت سفر کرنے کے حق میں نہیں تھے مگر ممی بضد کہ ابھی چلیں گے۔ جمیل اعجاز نے بھی ہمارے ساتھ سفر کیا تھا۔ کبھی وہ ڈرائیو کرتا' کبھی ممی اور کبھی ڈیڈی۔ میں پچھلی سیٹ پر بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھے میں سو گیا تھا۔

میں گہری نیند میں تھا جب اچانک ایسا لگا جیسے ڈیڈی مجھے پکار رہے ہیں میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں تو گاڑی رکی ہوئی تھی اور میں اس میں اکیلا تھا۔ وہ بالکل اندھیری سڑک تھی جس کے ایک طرف اونچے درخت اور دوسری طرف گہری جھیل تھی۔ میں اندھیرے میں باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تو گاڑی سے کچھ فاصلے پر ممی کھڑی نظر آئیں اور ڈیڈی کو جھیل میں دھکا دیتے جمیل اعجاز کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر لیے اس نے وہ لوہے کا مضبوط پائپ بھی پانی میں اچھال دیا تھا۔ ہاتھ جھاڑتا وہ ممی کی طرف آیا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس وقت میں ان لوگوں سے ڈر گیا تھا۔ مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا تھا وہ ڈیڈی جیسے اونچے لمبے مرد کو مار سکتے ہیں تو میری تو اوقات کیا ہے۔ میں آنکھیں مضبوطی سے بند کیے خود کو سوتا ظاہر کرتا رہا تھا۔ جس وقت اس نے وہ لوہا ڈیڈی کے سر پر مارا تھا ہو سکتا ہے اس وقت انہوں نے مجھے پکارا ہو یا کچھ ہو سکتا ہے یہ محض میرا وہم ہو۔

میں رونا چاہتا تھا بہت سارا رونا چاہتا تھا مگر خوف کے مارے میرے منہ سے ایک آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ جمیل اعجاز راستے ہی میں کہیں اتر گیا تھا۔ مجھے سوتا سمجھ کر وہ دونوں ہی مطمئن تھے۔ صبح میں نے اس عورت کو ڈیڈی کے لیے واویلا مچاتے پولیس میں رپورٹ درج کراتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر میری بزدلی نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہنے دیا۔

ڈیڈی کی لاش دیکھ کر میری چیخیں نکل گئی تھیں وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر تسلی دینے کے لیے آگے بڑھی تو میں دُور کر دور ہٹ گیا تھا۔ ڈیڈ باڈی لے کر ہم سٹڈی پہنچے تو لوگوں کا ہمارے گھر ہجوم جمع ہو گیا۔ سب افسوس کر رہے تھے۔

"بے چاری جوانی میں بیوہ ہو گئی ذرا سی تفریح اتنی مہنگی پڑی ہائے اب اس کا کیا ہو گا۔" جمیل اعجاز پہلے ہی سے سٹڈی میں موجود تھا۔ ان لوگوں کا پلان فول پروف تھا۔ کوئی بھی یہ بات ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ پچھلے ایک ہفتے میں جمیل اعجاز سٹڈی سے باہر کہیں گیا ہے۔ اس واقعے کا چشم دید گواہ میں تھا اور میرا خوف کبھی بھی مجھے کچھ نہ کہنے دیتا۔

میں ساری دنیا سے کٹ گیا تھا بالکل چپ ایسا لگتا تھا جیسے ڈیڈی کے ساتھ ساتھ میں بھی مر گیا ہوں۔ سوائے خوف کے کوئی احساس میرے اندر بیدار نہیں ہوتا تھا مجھے ایسا لگتا اچانک کسی روز وہ دونوں مل کر مجھے بھی بالکل ایسے ہی مار ڈالیں گے جیسے ڈیڈی کو مارا تھا۔ پھر میرا داخلہ بورڈنگ میں کروا دیا گیا۔ وہ کبھی کبھار مجھ سے ملنے آتی تو میں ڈر کے مارے ملنے سے انکار بھی نہ کرتا۔ مجھے پتا تھا وہ دونوں شادی کر چکے ہیں اور اب میرے گھر میں میری باپ کے قاتل رہ رہے ہیں میرے باپ کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں مگر میں کچھ نہ کر سکا تھا۔

میں رات کو سوتے سے ڈر کر اٹھ جاتا تھا سونمنگ کا دن ہوتا تو میں نیچر سے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیتا پانی کی طرف جاتے بھی مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ بتدریج کم ہوتے ہوتے شہلا عثمان کا آنا بالکل ہی ختم ہو گیا۔ پھر جب ایک روز مجھے پتا چلا کہ وہ دونوں دو سال ہوئے یہاں سے سارا کاروبار ختم کر کے جا چکے ہیں تو میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ میرے اکاؤنٹ میں جو پیسہ تھا وہ اور ہمارے گھر کے علاوہ وہ سب کچھ لے گئے تھے۔

میں اس وقت او لیول کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔ صرف پندرہ سال کا کم عمر لڑکا۔ مگر میرے اندر کوئی مسلسل بول رہا تھا "تم بزدل ہو ڈرپوک ہو بے غیرت ہو تمہارے باپ کے قاتل اسی دنیا میں دندناتے پھر رہے ہیں اور تم سکون سے بیٹھے ہو وہ عورت اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں سانس لے رہی ہے اور تم چین سے ہو۔"

مجھے دولت جائیداد چلے جانے کا کوئی غم نہیں تھا غم تھا تو یہ کہ میں اپنے ڈیڈی کے قاتلوں سے انتقام نہیں لے سکا تھا۔ پھر میں سر سے لے کر پاؤں تک تبدیل ہو گیا۔ میری بزدلی کی جگہ بے تحاشا بہادری نے لے لی۔ سونمنگ سے لے کر رائیڈنگ اور فائٹنگ تک میں نے سب کچھ سیکھا۔ مجھے اب کسی بات اور کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے ہر کوئی خائف رہتا تھا۔ میرے بہت سے دوست تھے مگر در حقیقت میرا کوئی دوست نہیں تھا میں کسی کو بھی اپنے اتنے قریب نہیں آنے دیتا تھا کہ وہ میرے ماضی میں جھانکے۔

یونیورسٹی کے دنوں میں میری بہت سی لڑکیوں سے دوستی رہنے لگی تھی۔ مجھے پتا تھا میری پرکشش شخصیت اور بے تحاشا دولت لڑکیوں کو میری طرف متوجہ کرتی ہے۔ کوئی میری آنکھوں پر فدا ہو جاتی تو کسی

کو میری باتیں اچھی لگتی اور کسی کو میں ٹینس کھیلتا بہت ہینڈسم لگتا۔ میں ان سب کو تفریح کی چیز سمجھتا تھا اور اپنی اس ایکٹویٹی میں مجھے بہت سکون ملتا تھا۔

مجھے در حقیقت اپنے علاوہ دنیا میں کسی سے محبت نہیں تھی۔ میرے لیے میرا کوئی دوست کوئی رشتہ اہم نہیں تھا۔ جب بھی کوئی لڑکی میرے قریب آتی مجھے اس میں ایک جانی پہچانی مکروہ شکل نظر آنے لگتی اور میرا دل چاہتا میں اس ہنستے چہرے پر تیزاب پھینک دوں۔ اس کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ مجھے عورت ذات سے نفرت تھی شدید نفرت۔ جب بھی میں کسی لڑکی کو استعمال کرنے والی شے سمجھ کر کچھ دنوں بعد دھتکار دیتا اور وہ روتی بلکتی محبت کی بھیک مانگنے میرے پاس آتی تو مجھے بڑا سکون ملتا۔

ایسا کوئی نظارہ دیکھے زیادہ دن ہو جاتے تو خود کسی لڑکی سے دوستی کر لیتا۔ جو جتنی معصوم اور سیدھی سادی نظر آتی مجھے وہ اتنی ہی اچھی لگتی۔ میں اپنی ذات کے بارے میں بے پناہ خود غرض تھا۔ قربانی ایثار اور صبر میرے خیال سے یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے بنے ہیں جو زندگی میں کچھ کرنا نہیں جانتے۔ جو چھین کر اپنا حق نہ لے سکے وہ صبر کا راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ میری لغت میں ان الفاظ کا کوئی گزر نہ تھا۔

"صبر کرو دوسروں کے لیے اپنی خوشیوں کو قربان کر دو تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔"

میں یہ باتیں کسی سے سنتا تو دیر تک دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا۔ "تقدیر۔۔۔ یہ تقدیر آخر کیا بلا ہے۔ میں کسی تقدیر کو نہیں مانتا۔ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے اگر مجھ میں طاقت ہے ہمت اور اعتماد ہے تو میں اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہوں اور صبر۔۔۔ صبر بزدل لوگ کرتے ہیں۔ بزدل اور کم ہمت اپنی کمزوری چھپانے کے لیے اسے صبر کے پردے میں چھپا لیتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم ترین اصول یہ بنایا تھا کہ کبھی کسی پر اعتبار نہ کرو اور خود سب کو اپنے آپ پر اعتبار کرنے پر مجبور کر دو اور اس اصول نے مجھے بہت کامیابی دی تھی۔

صرف ستائیس سال کی عمر میں میں ترقی اور کامیابی کے کئی سنگ میل عبور کر گیا تھا۔ کاروبار کے بارے میں میرے لیے صرف اس وقت تک قابل قبول تھا جب تک وہ مجھے فائدہ پہنچانے کا باعث ہوتا اور جہاں ایسا نہ ہوتا وہاں میں کسی اصول کو نہیں مانتا تھا۔ بزنس سرکل میں مجھے ایک سختی اور دیانت دار بزنس مین سمجھا جاتا تھا دراصل میں بے ایمانی بھی بہت ایمان داری سے کیا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میری ریپوٹیشن بہت اچھی تھی۔ میرے لیے کوئی بھی شخص اس وقت تک اہم ہوتا تھا جب تک وہ مجھے فائدہ پہنچا رہا ہوتا میں ہر کسی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور کمال کی بات یہ تھی کہ جسے استعمال کرتا اسے خبر بھی نہ ہوتی کہ میں نے کیا گیم کھیلا ہے۔

میرے تمام دوست سمجھتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بہت مخلص ہوں اور میں ان کی سادہ دلی پر ہنس پڑتا تھا۔ مجھے جاننے والے سب لوگ کہتے کہ میں بہت مضبوط اور قوی اعصاب کا مالک ہوں مجھے بڑی سے بڑی بات بھی پریشان نہیں کر سکتی۔ میری یہ خوبی میرے بہت کام آتی تھی۔ بزنس کے تمام اتار چڑھاؤ میں نہایت مہارت سے ہینڈل کر لیا کرتا تھا۔ میرے دوست اس خوبی کو سراہتے تھے اور مخالفین اس بات سے خوفزدہ رہتے تھے کہ وہ کچھ بھی کر لیں مجھے ہرا نہیں سکیں گے۔ میں زندگی میں ہر طرح سیٹل ہو گیا تھا۔ میرے دوست مجھے شادی کا مشورہ دیتے تو میں بات ٹال جاتا۔

"شادی اور میں۔" میں خود سے کہتا۔ "کیا میں کبھی کسی عورت پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ شاید وہ کوئی آسمان سے اتری حور بھی ہو تو میں اس پر بھی اعتبار نہیں کروں گا۔" میرے اعصاب شادی کا سوچ کر چٹخنے لگتے تھے۔ ہر طرح سے کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود مجھے ایک بے سکونی لاحق تھی۔ یوں جیسے زندگی میں ابھی کوئی اہم کام کرنا باقی ہے۔

مجھے اب جمیل اعجاز سے کوئی دشمنی نہ تھی عورت اگر شہلا عثمان جیسی ہو تو جمیل اعجاز بہت۔ وہ عورت جو اپنا گناہ چھپانے کے لیے اپنے بیٹے کی قسم کھانے

سے بھی دریغ نہ کرے۔ وہ کس قدر بد کردار عورت ہو گی۔ کاش میں اس وقت آج جتنا مضبوط اور طاقت ور ہوتا تو اس عورت کے جسم کے اتنے ٹکڑے کر دیتا کہ کوئی پہچان بھی نہ پاتا۔

بے غیرتی کی زندگی میں نہیں جینا چاہتا تھا۔ پھر میں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ گو یہ ایک مشکل کام تھا مگر میں اپنے ارادوں میں اٹل تھا اگر وہ اس دنیا میں کہیں موجود ہے تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ چاہے جیسے بھی۔ پورے چار سال کی کوششوں کے بعد میں اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا تھا۔

وہ ڈیڈی ہی کے گفٹ میں دیے ایبٹ آباد کے مکان میں رہ رہی تھی اور اس کے بارے میں پتا چلتے ہی میں فوراً" پاکستان آگیا تھا۔ مجھے کیا کرنا تھا یہ میں سوچ چکا تھا۔ اس کے بارے میں تمام معلومات میں بڑی ہوشیاری سے حاصل کر چکا تھا۔ وہ اس گھر میں اپنے نوکروں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ جمیل اعجاز اور اس میں شادی کے سات سال بعد ہی علیحدگی ہو گئی تھی۔ جمیل اعجاز پانچ سال ہوئے مر چکا تھا اس کی موت اپنے ہی گھر کے سوئمنگ پول میں ڈوب کر ہوئی تھی۔ سنا تھا اس نے شراب بہت پی رکھی تھی۔ لوگوں کو اس کی موت ایک معمہ محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا میرے لیے تو وہ Mr, Nobody تھا۔ وہ قتل ہوا تھا یا اپنی طبعی موت مرا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ان دونوں کی علیحدگی کیوں ہوئی مجھے اس سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ اسلام آباد سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے راستے میں مجھے ایک خاتون کو لفٹ دینی پڑی تھی۔ مجھے انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا بخار کبھی نہیں چڑھا' مگر پتا نہیں کیا بات تھی میں انہیں انکار نہیں کر پایا تھا۔ راستے میں ایک جگہ پیٹرول دلوانے کے لیے گاڑی روکی تو پیٹرول پمپ پر کھڑا ایک اچھا خاصا صحت مند اور تندرست آدمی ان کے پاس آکر اپنی بیوی کی بیماری اور اپنی بیروزگاری کی داستان سنا کر مدد کی درخواست کرنے لگا انہوں نے فوراً" پرس کھول کر اسے پیسے دیے تھے۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ انہیں کہتا یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر پیچھے بیٹھا ان کا ڈرائیور بول اٹھا تھا۔

"مکاری کر رہا تھا یہ آدمی۔ جھوٹ بول کر اس نے آپ سے پیسے لیے ہیں۔"

"ہم جھوٹ سچ کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ وہ جانے اور اس کا ایمان۔ مجھ سے اس نے مانگا میں نے دے دیا۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" وہ بڑے اطمینان سے گویا ہوئی تھیں۔

ان کی یہ بات سن کر مجھے اچانک ہی ایک نیا خیال سوجھا تھا۔ "خاتون ٹھیک ٹھاک بے وقوف ہیں اور ان کی بے وقوفی میرے بہت کام آسکتی ہے۔"

میں نے جان کر ان کے سامنے ایبٹ آباد میں اپنی رہائش کا مسئلہ بیان کیا۔ میں وہاں خود کو چھپا کر رکھنا چاہتا تھا کسی اچھے اور بڑے ہوٹل میں ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں تھا وہاں وہ مجھے فوراً" تلاش کر سکتی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق انہوں نے مجھے اپنے گھر رہنے کی پیشکش کر دی تھی۔ واقعی میرے اندازے مشکل ہی سے غلط ثابت ہوتے ہیں۔

ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جگہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ میں اپنی اس کیفیت کو آج تک نہیں سمجھ پایا۔ وہ میری اب تک کی زندگی میں ملنے والے تمام لوگوں سے زیادہ سادہ اور بے وقوف تھیں۔ مجھ پر دل و جان سے فدا ہوتی' بیٹا بیٹا کر کے بات کرتیں جو کچھ میں نے انہیں اپنے بارے میں بتایا تھا انہوں نے اس سب پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا اور میں poor lady کہہ کر اس سادگی پر ہنس دیا تھا۔

انہوں نے مجھے اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا باوجود میرے بہت انکار کے وہ بضد ہوئیں تو میں مان گیا تھا اور وہیں پہلی مرتبہ میں نے ہانیہ محمود کو دیکھا تھا۔

وہ اپنی اب تک کی ملاقاتوں میں کئی بار اپنی بھتیجی کا ذکر کر چکی تھیں۔ کھانے کی میز پر وہ شرمندہ سی سر جھکائے بیٹھی تھی اسے شاید اپنی باتیں سن لیے جانے

پر شرمندگی تھی۔ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ عام سے کپڑوں میں بھی وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی اور یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ مجھے سادہ اور معصوم لڑکیاں کس قدر اٹریکٹ کرتی ہیں۔ میں یہاں ایسے کوئی ارادے لے کر نہیں آیا تھا مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں، بالکل اسی طرح اسے دیکھ کر میرے اندر کا مرد مجھے اکسانے لگا تھا۔ آجاؤ اپنے اصلی روپ میں۔

میں برآمدے میں کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے اپنی دن بھر کی کارکردگی پر خوش ہو رہا تھا۔ آج میں نے اسے دن بھر میں پانچ بار دھمکی آمیز فون کیے تھے وہ بھی مختلف جگہوں سے۔ دو فون نوشہرو کے مختلف پی سی اوز سے کیے اور تین مری کے مختلف ہوٹلوں سے۔ مجھے پتا تھا دھمکی ملتے ہی وہ پہلے تو ڈر جائے گی پھر شاید پولیس سے مدد لے گی اور میں کہاں سے فون کر رہا ہوں یہ معلوم کرنے کی تگ و دو کی جائے گی۔ مری اور نوشہرو کے تمام ہوٹلوں میں میری تلاش کی جائے گی اور کسی کو یہ پتا ہی نہیں چل سکے گا کہ میں اس کے کتنے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ جب چاہوں اس کی زندگی کی ڈور کاٹ سکتا ہوں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے گردن ذرا سی گھما کر دیکھا تو وہ کھڑکی میں کھڑی بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا دل قہقہہ لگا کر ہنسنے کو چاہا۔ دنیا کی ہر لڑکی ایک سی ہوتی ہے۔ میں نے ابھی تک شملا عثمان پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی تھی یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی کہ اس کی جان کا دشمن کون پیدا ہو گیا۔ آنے سے پہلے میں ایک پارسل اپنے ملازم کے حوالے کر کے آیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد اسے پاکستان روانہ کرے۔ جب اسے وہ پارسل ملا ہوگا تو اس کی چیخیں نکل گئی ہوں گی۔

اس پارسل میں میں نے ڈیڈی کی وہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی شرٹ ڈالی تھی جو ان کے مردہ تن پر سے اتری تھی اور جسے میں نے اس وقت سب سے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں صبح صبح ہی نوشہرو چلا گیا تھا اور وہیں سے اسے فون کیا تھا۔ میری آواز سن کر وہ ڈر پڑی تھی۔

"کون ہو تم کیا چاہتے ہو؟" اس کی آواز میں موجود ڈر اور خوف میرے لیے باعث تسکین تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔ میں بڑی خوشی خوشی واپس آیا تو وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی گارڈننگ میں مصروف تھی۔

میرے پیچھے سے آکر ایک دم بولنے پر وہ بری طرح ڈر گئی تھی اور اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس کی اس بات پر مجھے بڑی ہنسی آئی تھی کہ وہ میری غیر موجودگی کی وجہ سے برآمدے میں آئی تھی۔ "بہت دیکھی ہے میں نے تم عورتوں کی پارسائی۔ ابھی ذرا سی توجہ دینے کی دیر ہے ساری مشرقیت اور شرافت بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔" میں نے اس کے بارے میں حقارت سے سوچا تھا۔ "اگر میں فرصت سے یہاں آیا ہوتا تو اب تک محترمہ میرے عشق میں سر سے پاؤں تک ڈوب چکی ہوتیں۔"

میں بھرے بازار میں شملا عثمان کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی روکے کھڑا تھا۔ وہ اپنے ملازم کو ساتھ لیے کسی دکان میں گھس گئی تھی۔ اس کا پالتو کتا گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ میں اتر کر اس کی گاڑی کے پاس گیا اور گاڑی کا لاک کھول کر کتے کو بھونکنے کا موقع دیے بغیر اس کے جسم میں خنجر اتار دیا تھا۔ بھرے بازار کی گہما گہمی میں کسی نے بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ خنجر اس کے جسم سے واپس نکال کر میں نے اسے سکون سے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور گاڑی واپس لاک کرتا اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا اور کن انکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا کہ کہیں کوئی میری طرف متوجہ تو نہیں۔

میں ابھی یہیں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وہ دہشت زدہ اور خوف و ہراس میں ڈوبی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا اسی

وقت بانیہ سامنے سے آتی نظر آئی۔ سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے۔ وہ گھر میں بھی ہر وقت بڑے بڑے دوپٹہ اوڑھے رکھتی تھی میں نے کبھی اس کا دوپٹہ سر سے اترا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی بھی تھی۔ وہ دوستانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی بھی تھی مگر اس وقت میں جس مشن پر تھا کسی جان پہچان والے سے گفتگو افورڈ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ شاپنگ کر کے واپس آئی اور اپنے ملازم سے باتیں کرتے ہوئے گاڑی کا لاک کھولا تو اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ کتے کا خون پوری سیٹ پر پھیل چکا تھا۔ ارد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا میں بھی گاڑی سے اتر کر اس ہجوم میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹی ہوئی تھیں پھر وہ وہیں بھرے بازار میں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

میں بڑا سرشار اور مطمئن گھر لوٹ آیا تھا۔ جو کچھ میں کر رہا تھا اس پر بہت مطمئن اور خوش تھا۔ شملا عثمان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی۔ اپنے کتے کی موت سے اس پر بے تحاشا دہشت طاری ہو گئی تھی۔

صبح میرا موڈ بڑا خوشگوار تھا۔ میں جوگنگ کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پر کیف ہوا چل رہی تھی۔ میرا دل خوش تھا اس لیے یہ منظر آنکھوں کو اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ واپسی میں وہ مجھے باغ میں چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ سبز لباس میں وہ اس سبزے ہی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ سبج سبج گھاس پر پاؤں رکھتی۔ میں بے اختیار اس کے پاس چلا آیا تھا۔

اپنے کل کے نظر انداز کیے جانے پر اس کا موڈ خراب تھا اس لیے وہ مجھے اگنور کر رہی تھی۔ "یہ لڑکی آنکھوں میں آنسو بھرے مجھ سے محبت کی بھیک مانگتی ہوئی کیسی لگے گی؟" میں نے فوراً سوچا تھا۔ میں ان حسین آنکھوں میں اپنے لیے آنسو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا مجھے نظر انداز کرنے والا اسٹائل مجھے اس کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ وہ اگلی بار پھر میری غیر موجودگی میں اپنے پودوں کا جائزہ لینے آئی تھی۔ حسب سابق مجھے دیکھ کر وہاں سے جانے لگی تھی۔ اس کی اکڑ اور ضد مجھے بھی ضد دلا رہی تھی۔ بہت اصرار پر وہ اندر آئی تھی۔ صوفے پر میرے برابر بیٹھنے کے بجائے سامنے رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ "ذرا سے التفات کی دیر ہے یہ شرافت وغیرہ سب دھری رہ جائے گی۔" میں نے نفرت سے سوچا تھا۔

شملا عثمان ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو گئی تھی۔ اس کے گھر پر دو پولیس اہلکار تعینات کر دیے گئے تھے۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے ایک باڈی گارڈ بھی رکھ لیا تھا۔ میں اس کے ان حفاظتی اقدامات پر ہنس دیا تھا۔ میں صہیب ریاض ہوں اور جب میں کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ میں چاہتا تھا اس کی ایک ایک سانس ڈر ڈر کر گزرے۔ وہ رات کو سکون سے سونہ پائے اسے ہر لمحہ اپنی جان کا دھڑکا لگا رہے۔ یوں لگتا ایسا کر کے میں اس دس سالہ بچے کو سکون پہنچا رہا ہوں جو رات کو ڈیڈی ڈیڈی پکارتا سوتے سے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور جس کا روم میٹ بعد میں سب کلاس فیلوز کے سامنے اس کے ڈرنے کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

سب کچھ میری مرضی کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ "شملا عثمان! وقت وقت کی بات ہے، کبھی وقت تم پر مہربان تھا آج وقت کی طنابیں میرے ہاتھوں میں ہیں۔" میں طمانیت سے سوچا کرتا۔

میں اکثر بانیہ کو رات کے وقت کھڑکی سے باہر ادھر ادھر جھانکتا دیکھا کرتا تھا۔ میں رات کو دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار تو ایسا لگتا کہ وہ سوتے سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر کچھ دیکھ رہی ہے۔ ایک بار جب وہ رات کے تین بجے اسی طرح اٹھ کر باہر جھانکنے کے بعد کھڑکی سے ہٹی اور میں نے اسے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا تو مجھے تھوڑا سا تجسس ہوا۔

میں انیکسی سے نکل کر دبے پاؤں ان لوگوں کے پورشن کی طرف آگیا۔ میں نے لاؤنج کی کھڑکی سے

اندر جھانکا تو وہ بڑے وہمی انداز میں تمام دروازے چیک کر رہی تھی۔ جو کھڑکیاں کھلی ہوئی نظر آ رہی تھیں' انہیں جلدی جلدی بند کر رہی تھی۔ اس کے لائٹ براؤن بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس بکھرے بکھرے حلیے میں وہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں نے اس کی طرف خباثت سے نہیں دیکھا تھا۔

وہ اتنی پیاری اور معصوم لگ رہی تھی کہ میں مبہوت رہ گیا تھا۔ جس کھڑکی کے پاس میں کھڑا تھا وہ اس کی طرف آئی تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں واپس آیا تو میرے دل کی کیفیت عجیب سی تھی۔ بار بار آنکھوں کے سامنے اس کا دلکش سراپا آ رہا تھا۔ کیا وہ واقعی اتنی ہی معصوم تھی جتنی نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ اس طرح راتوں کو جاگ کر سارے گھر میں کیوں پھرتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔

"کیا وہ سوتے میں ڈر جاتی ہے۔ اتنی بڑی لڑکی بچوں کی طرح ڈرتی ہے۔" مجھے تعجب ہوا تھا۔

مجھے وہاں ہر صبح کا وقت سب سے اچھا لگتا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ' ٹھنڈی اور معطر ہوائیں' پھولوں پر پڑے شبنمی قطرے۔ میں فطرت کا دلدادہ کبھی نہیں رہا' مگر یہاں شاید فراغت میسر تھی اس لیے یہ چیزیں مجھے بے حد متاثر کیا کرتیں۔ آنٹی صبح صبح باہر آ کر چڑیوں کے لیے باجرہ اور پانی رکھتیں اور پھر اندر اپنی چوکی پر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرنے لگتیں۔ ان کی خوش الحانی سے کی تلاوت کی آواز واک کرتے ہوئے مسلسل میری سماعت سے ٹکراتی رہتی اور اکثر میں ان کی آواز کی چاشنی اور مٹھاس میں کھو سا جاتا تھا' صبح کے اس سہانے منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی تھی ان کی آواز۔

میری طبیعت خراب ہوئی تو وہ خود بخود چلی آئیں۔ میں ان کے اس طرح آنے پر حیران تھا۔ "کل سے تم مسلسل گھر پر ہو۔ مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں۔" میرے استفسار پر وہ بڑے پیار سے بولی تھیں۔

معمولی بخار کو خاطر میں لانے والا تو میں ہرگز نہ تھا بس یہ تھا کہ کہیں باہر جانے کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔ پین کلر لے کر میں بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھتا رہا تھا۔ مگر وہ اس طرح پریشان ہو گئی تھیں جیسے پتا نہیں میں کتنا شدید بیمار ہو گیا ہوں۔ جلدی سے دودھ گرم کر کے لائیں' بصد اصرار مجھے دودھ پلوایا' دوا کھلائی۔ میں خاموشی سے لیٹا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے غیریت برتی۔ طبیعت خراب تھی اور انہیں بلایا تک نہیں۔

"اٹھنے کی ہمت نہیں تھی تو فون پر بلا دیتے دیکھو تو ایک دن کے بخار میں کیا حالت ہو گئی۔" وہ میرے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئیں اور میرا سر دبانے لگیں۔

ان کے ہاتھوں کا لمس پا کر میں کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں منع کیا۔ بہت کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ سر میں درد نہیں۔ مگر وہ میری تمام باتیں نظر انداز کر کے میرا سر دباتی رہیں۔

"سب پتا ہے مجھے' تم ہم لوگوں سے تکلف برتتے ہو۔ ابھی یہاں تمہاری سگی ماں ہوتی میری جگہ تو کیا تم اسی طرح کرتے۔ اسی طرح اس کے ہاتھوں سے سر دبوانے سے انکار کرتے۔" ان کی بات مجھے اندر تک ہلا گئی تھی۔

"سگی ماں۔" کتنا بدصورت تھا یہ لفظ میرے لیے میرا دل چاہا میں انہیں دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال دوں۔ کون تھیں وہ میرے زخموں کو کریدنے والی' انہیں کس نے حق دیا تھا میری ذاتیات میں مداخلت کرنے کا۔ مگر میں ان سے کوئی بھی بدتمیزی نہیں کر پایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے سوتا سمجھ کر کمرے سے چلی گئی تھیں۔ میں بستر پر پڑا اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

"سگی ماں۔" میرے اعصاب پر یہ الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ رات میں وہ پھر کھانا لیے چلی آئی تھیں۔ میں نے بغیر کسی لحاظ کے

اچھی خاصی بد تمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانا کھانے سے انکار کیا تو وہ بجائے برا ماننے کے مسکراتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئیں۔

"بالکل صفی کی طرح کی عادتیں ہیں تمہاری۔ وہ بھی بیماری میں ایسا ہی چڑچڑا ہو جایا کرتا تھا۔" اور پتا نہیں کیوں اس لمحے میرا دل چاہا تھا کہ کاش میں صفی ہوتا۔ کتنا خوش قسمت تھا وہ اسے کتنی سچی اور خالص محبت نصیب تھی۔

وہ یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی موجود تھا۔ وہ عورت مجھ میں اسی کی شبیہہ دیکھ رہی تھی اور اپنی ممتا کو تسکین پہنچا رہی تھی۔ مگر یہ سوچ صرف لمحے بھر کے لیے تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا میں کیا سوچ رہا ہوں۔ محبت اور میں۔ دو بالکل الگ الگ باتیں ہیں۔ مجھے کسی قسم کی محبت اور چاہت نہیں چاہیے۔ میں ان چیزوں کو بے کار لوگوں کے کام کی چیز سمجھتا ہوں۔"

اس رات میں بہت پریشان رہا تھا۔ کبھی میرے سامنے ایک عورت اپنے شوہر کا خون کرتی نظر آتی اور کبھی ایک عورت سفید دوپٹہ سر پر اوڑھے چہرے پر نورانی سی چمک اور دھیمی سی مسکراہٹ لیے میرا سر دبانے لگتی۔ میں عورت کے کس روپ کو پہچانوں۔ جو میں نے اکیس برس پہلے دیکھا وہ سچ تھا یا جو آج دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے۔

صبح میں اٹھتے کے ساتھ ہی نہانے گھس گیا تھا۔ رات بھر کی ٹینشن اور الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں ٹھنڈے پانی سے نہایا اپنے اعصاب کو پرسکون حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہانیہ کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر میں خوش کیوں ہوا تھا مجھے نہیں معلوم۔ وہ آ تو گئی تھی مگر اب اپنے آنے پر کچھ شرمندہ بھی تھی۔

جائز ناجائز میں نے جو بھی کام کیے تھے میں ان سب کے لیے خود کو حق بجانب سمجھتا تھا اور اب بھی میں جو کچھ کر رہا تھا اس پر مطمئن تھا۔ میرے پاس میرے ہر عمل کی justification موجود تھی۔ مگر پھر یہ کون تھا جو مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو خیال آیا بہت دن ہو گئے میں نے شہلا عثمان کو نہ تو کوئی فون کیا تھا نہ ہی کوئی اور ایسی حرکت جو اسے اذیت دینے کا باعث ہوتی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں واقعی یہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں۔ میں زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارا کرتا تھا۔ تھوڑی بہت دیر باہر تفریح کی اور پھر گھر، کہیں باہر بھی جاتا تو واپس اسی جگہ آنے کے لیے بے چین سا رہتا۔ اس گھر میں ایسی کیا بات تھی۔ جب مجھے اس بات کا خیال آیا کہ میں اپنا مقصد بھول رہا ہوں تو فوراً ہی نئے سرے سے خود کو تیار کیا۔

اس کے گھر پر سے پولیس فورس ہٹ گئی تھی صرف اس کا باڈی گارڈ ہی اب اس کی حفاظت کے لیے موجود تھا۔ میرے اتنے دن کوئی کونٹیکٹ نہ کرنے کی وجہ سے پولیس والے ان سب باتوں کو اس کا وہم اور کسی کی شرارت کہہ کر جا چکے تھے لیکن وہ خود بہت خوفزدہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ کوئی ہے جو اسے واقعی مار دینا چاہتا ہے۔ اب کی بار میں اس کے گھر میں گھسا تھا۔

جب ارادے اٹل ہوں تو کوئی ناممکن نہیں ہوتا اس کے گھر میں الیکٹریشن بن کر گھسنا میرے لیے ہرگز مشکل نہ تھا۔ میں اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ موت اس کے کتنے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بیڈ روم کے ڈریسنگ ٹیبل پر مارکر سے بڑا بڑا جلی حروف میں "میں تمہیں مار ڈالوں گا" لکھ آیا تھا۔ آتے وقت ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل اٹھانا میں ہرگز نہیں بھولا تھا۔ اب کی بار میں اسے اسی کے موبائل سے فون کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں اب کی بار یہ سب کر کے دل خوش نہیں ہوا تھا۔

اتوار کا دن تھا میں بستر پر سستی سے پڑا انگڑائیاں لے رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو سامنے ہانیہ کھڑی تھی۔ مجھے ناشتے کے لیے بلانے۔ اس کے گلابی آنچل کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا یہ رنگ آج سے پہلے کبھی اتنا اچھا کیوں نہیں لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر فقرے اچھال رہے تھے۔ میں اس

کے جوابوں سے محظوظ ہوتا ہوا اپنی شرٹ استری کرنے لگا تو وہ فوراً آگے بڑھ آئی اور اپنی خدمات پیش کیں۔ میرے دو ٹوک انکار پر اس کا کھلا ہوا چہرہ ایک دم مرجھا گیا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے وہیں سے چلی گئی تھی۔ ان کے یہاں پہنچا تو ناشتے کی میز پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ مجھے نظر انداز کر کے قصداً ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

ناشتے کے دوران بھی وہ بالکل چپ رہی تھی۔ آنٹی اس سے اور کھانے کے لیے اصرار کر رہی تھیں اور وہ منہ پھلائے ضدی انداز میں انکار کر رہی تھی۔ اس طرح ناراض بیٹھی ہوئی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے بے اختیار میں نے دعا کی تھی کاش یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے اگر یہ خواب ہے تو میں سوتا ہی رہوں کبھی میری آنکھ نہ کھلے۔

اس پل میں نے سوچا تھا کہ کیا شداد کی جنت اس جنت سے زیادہ خوب صورت ہوگی۔ کیا اس جگہ سے زیادہ خوب صورت روئے زمین پر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے۔ میں باہر نکلا تو وہ اخبار ہاتھ میں لیے ہنوز ناراض بیٹھی تھی۔ وہ ناراضی جو اپنائیت کا پتا دیتی ہے۔ جب ہم کسی اپنے سے روٹھ جاتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں منائے گا۔ میں بے اختیار اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کے ناراض چہرے پر میری باتوں سے مسکراہٹ پھیلی تو میں بھی مسکراتا ہوا اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس سے باتیں کر کے میرا دل چاہا کاش میں واقعی تیمور سجاد ہوتا" کاش میرا کوئی بھیانک ماضی نہ ہوتا" کاش میں نے ان لوگوں کو اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہوتا" کاش جیسا یہ مجھے سمجھتے ہیں میں ویسا ہی ہوتا۔

میرے دل سے ایک آہ نکلی تھی۔ "تمہارے دل میں میری طرف سے جو وسوسے تھے وہ سب بالکل صحیح تھے۔" پھر میرے اندر سے آواز ابھری تھی۔ میرا دل چاہا میں وہیں بھاگ جاؤں کہیں دور چلا جاؤں۔ کمرے میں آ کر میں کتنی دیر تک گم صم بیٹھا رہا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں صہیب ریاض زندگی میں اپنے کسی عمل پر کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ میرے لیے دنیا کا کوئی شخص اہم نہیں سوائے اپنی ذات کے۔" میں خود کو باور کرا رہا تھا۔"

اپنی بدلتی ہوئی کیفیت مجھے پریشان کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے ایک حصہ صہیب ریاض کے ساتھ ہے اور ایک تیمور سجاد کی طرف۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔ شام تک یہ اضطراب اور بے قراری ایک ہیجان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ خود کو تمام سوچوں سے آزاد کرتے ہوئے میں نے اس کا نمبر ملایا۔

"مجھے اپنا مقصد فراموش نہیں کرنا۔" میں نے خود سے سخت لہجے میں کہا تھا۔ میں فون پر اس سے بات کر رہا تھا اسے شک ہو گیا تھا کہ میں صہیب ہوں اسی وقت مجھے وہاں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو ہانیہ ہاتھوں میں کچھ پکڑے کھڑی تھی۔ میرا غیظ و غضب سے برا حال ہو گیا۔ اسے میرے بارے میں سب پتا چل گیا یہ سوچ ہر سوچ پر حاوی تھی۔ مجھ پر ایک جنون سوار ہو گیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر میں نے دو قدموں سے آگے اسے بڑھنے ہی نہ دیا تھا۔ اسے انتہائی بے رحمی اور سنگدلی سے کھینچ کر کمرے میں لاتے ہوئے میرے دل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں اس وقت صہیب ریاض تھا جو اپنے راستے میں آنے والے کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ مجھ سے التجائیں کر رہی تھی گڑگڑا رہی تھی اور میں سکون سے کھڑا اسے اذیت دے رہا تھا۔ اس کا منہ میں نے اتنی سختی سے بند کیا تھا کہ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ مجھے اس پر کوئی رحم نہیں آ رہا تھا۔ کیوں آئی یہ یہاں۔ میرا اصلی روپ اگر دیکھ ہی لیا ہے تو اب باقی سب بھی دیکھتی جاؤ ہانیہ محمود۔ میری پوری قوت سے مارے اس تھپڑ سے وہ بے حال سی ہو گئی تھی اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اسے انتہائی سفاک اور سرد لہجے میں میں نے کوئی بھی بات کسی کو بتانے سے منع کیا اور وہاں سے

جانے کو کہا تو وہ دیوانہ وار وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

وہ چلی گئی تھی اور میں خاموش کھڑا اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب جبکہ اسے میری اصلیت پتا چل گئی ہے مجھے جلد از جلد کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ باہر سے آتا بارش کا شور مجھے ڈسٹرب کر رہا تھا میں دروازہ بند کرنے کے لیے آگے بڑھا تو فرش پر جا بجا کچھ پڑا ہوا تھا۔ الٹی پڑی ہوئی ڈش اور کوئی کھانے کی چیز وہ میرے لیے کچھ پکا کر لائی تھی۔

"میرے لیے؟" میں نے خود سے کہا۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دیکھنے لگا۔

میں نے وہ سب اٹھا کر ٹرے میں بھرنے شروع کر دیے۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ گلابی دوپٹہ پڑا ہوا تھا جسے آج اس کے سر پر دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ گلابی رنگ دنیا کا سب سے حسین رنگ ہے۔ دوپٹہ میں نے ہاتھوں میں لیا اور کمزا: ہوا تو میرے اندر دور دور تک سناٹا پھیلا تھا۔ وہ دونوں چیزیں اٹھا کر میں کمرے میں واپس آ گیا۔ دیوار کے پاس ٹوٹی ہوئی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں کی ایک ایک چیز میری سفاکی کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ کیا کر رہی ہوگی۔ وہ ٹھیک تو ہوگی ناں۔

میرے اندر مختلف خدشے بیدار ہونے لگے۔ میں بے اختیار پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا ان کے پورشن میں داخل ہوا۔ وہ یتیم کے بچوں بیچ فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

"ہانیہ۔" میں چیختا ہوا اس طرف لپکا تھا۔ "اوہ میرے اللہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ ہانیہ پلیز اٹھو، پلیز آنکھیں کھولو۔" میں جنونی انداز میں اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

وہ جو راتوں کو سوتے سے ڈر کر اٹھ جایا کرتی تھی، مجھ جیسے شیطان کا اصلی روپ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں اور میرے ہاتھوں کے نشان واضح نظر آ رہے تھے۔ میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ یہ چہرہ جو پھول سے بھی زیادہ نرم و نازک ہے اسے۔ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر رو پڑا تھا۔ ہاں میں واقعی رویا تھا۔

"ہانیہ! آنکھیں کھولو۔ خدا کے لیے اٹھ جاؤ۔" میں ڈیڈی کے مرنے کے بعد زندگی میں دوسری دفعہ رویا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح۔ مگر میری کوئی آواز کوئی پکار اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی رہی تھی۔

میں اسے اٹھا کر کمرے میں لایا اور بیڈ پر لٹا کر باہر بھاگا۔ گیٹ سے باہر گاڑی نکال ہی رہا تھا کہ آنٹی واپس آ گئی تھیں۔ میں نے نظر انداز کر کے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

"یا اللہ اسے کچھ نہ ہو۔ مجھ سے سب کچھ لے لے، ہر خوشی، ہر سکھ جو کچھ میرے پاس ہے سب لے لے بس وہ ٹھیک ہو جائے۔" طوفانی بارش میں فورتھ گیئر میں گاڑی چلاتا پاگلوں کی طرح یہی بات کہے جا رہا تھا۔ اس دل کی دھڑکن کے ساتھ تو میری سانسوں کی ڈور بندھی ہے۔ اسے کچھ ہوا تو کیسے جی پاؤں گا۔

ڈاکٹر کو لے کر میں واپس گھر پہنچا تو آنٹی اس کے سرہانے بیٹھی مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کے تفصیلی معائنے اور تسلی آمیز جملے "فکر کی کوئی بات نہیں" کے باوجود وہ مسلسل رو رہی تھیں۔

"میری غلطی ہے میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ جب پتا ہے کہ یہ بہت ڈرتی ہے تو اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ پتا ہے تیمور! ہانیہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ بڑی بہادر اور بولڈ لڑکی تھی۔ بہنا کی وفات کے بعد سے اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہتی ہے پھپھو ہم اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہمیں اکیلا سمجھ کر کوئی بھی ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور بارش سے تو یہ کس قدر ڈرتی ہے۔ جس روز بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی ہے تو اس دن تو ہانیہ مجھ سے لپٹ کر سوتی ہے۔ لاکھ کوشش کرتی ہوں میں نے مگر اس کا خوف دور نہیں کر پائی۔ کبھی سوچتی ہوں شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر خیال آتا ہے یہ اتنی نازک اور حساس ہے، اس کا شوہر اس کا خیال صحیح سے رکھ بھی پائے گا کہ نہیں۔ حالانکہ کتنے سارے رشتے آئے ہیں مگر میرا

دل نہیں مانتا ہے۔" وہ روتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھیں یا دل خود پر تھوکنے کو چاہا تھا۔

وہ کیسی قیامت کی رات تھی ہم دونوں اس کے پاس بیٹھے اس کے ہوش میں آنے کے منتظر تھے۔ بے ہوشی میں وہ کئی بار چلائی تھی۔

"پھپھو! مجھے بچا لیں، پھپھو! مجھے بچا لیں۔" اور اس کی یہ پکار مجھے ندامت سمندر میں غرق کر رہی تھی۔ اسے ہوش آیا تو سب سے پہلا جملہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"پھپھو! مجھے چھپا لیں، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" میں کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنٹی کے منہ سے میرا نام سن کر اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے لگا ابھی وہ چیخ چیخ کر کہے گی۔

"پھپھو! یہ تو جھوٹا ہے۔ مکار ہے اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ پھپھو اس کی کسی بات کا یقین مت کیجیے گا۔ اس بچے پر ہاتھ اٹھایا، مجھے اذیت دی، اس کی وجہ سے میرا آنچل میرے سر سے ہٹا۔ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔"

مگر میری توقع کے خلاف وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ لب بھینچے ہوئے جیسے اب زندگی میں کبھی کچھ بولنا نہیں چاہتی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور ہونٹوں کی خاموشی مجھے برسوں پہلے کی ایک اندھیری رات یاد دلا گئی تھی جب ایک معصوم بچے نے باپ کا قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر خوف کے مارے اس کے منہ سے چیخ نہیں نکل پائی تھی۔ جو دنیا کو چیخ چیخ کر اپنے باپ کے قاتلوں کا نام نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جو نہ اپنے باپ کو بچا سکا تھا اور نہ خود کو بچانے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کے ڈر نے اسے خاموش رکھا تھا۔ ہانیہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"باپ کے شریف خون کے ساتھ ساتھ میری رگوں میں اس ناکس کا گندا خون بھی تو دوڑ رہا ہے۔ دوسروں کے اعتماد سے کھیلنا انہیں دھوکا دینا یہ تو میرے خون میں شامل ہے۔ خون کا اثر تو آتا ہے جو اس بدکردار عورت نے مجھے دیا کیا اس کی رذیل فطرت کا کوئی اثر مجھ میں نہ آتا۔"

زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود کو اس عورت کے حوالے سے گالی دی تھی۔ اور خود اپنے آپ کو گالی دینا آسان کام نہیں۔ میں تقدیر کو نہیں مانتا تھا اور تقدیر سامنے کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ کیا اب بھی مجھے نہیں مانو گے۔ آج مجھ سے لڑو میں نوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا یہ زندگی میرا کیسا امتحان لے رہی تھی۔

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو تیرے ہاتھوں میں اک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے!
کس لیے بنایا ہے!
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے
سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں!

مجھے اب کیا کرنا ہے میری بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اکیس برس میں نفرت کی آبیاری کی جسے اپنے خون جگر سے سینچا کیا وہ اتنی کمزور تھی کہ محض ڈیڑھ بیہ ماہ کے عرصے میں ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ کیوں میرا دل میرے خلاف رہا تھا کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں جو کچھ کر تا رہا ہوں۔ وہ سب غلط تھا۔

ان حسین آنکھوں میں میرے لیے آنسو تھے۔ وہ میرے سامنے بیٹھی زار و قطار روتے ہوئے میری محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ جشن منانا چاہیے تھا میری خواہش کتنی جلدی پوری ہو گئی تھی۔ ان حسین آنکھوں سے بہنے والا ہر اشک میرے لیے تھا میری وجہ سے تھا۔

اس کا ہر اشک میرے دل پر گر رہا تھا۔ اور مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ آگے بڑھ کر ان آنکھوں سے آنسو صاف کروں۔ اس سے کہوں کہ بس میں ہی وہ

شخص ہوں، جس پر تم آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی ہو۔ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی تمہیں ڈرنے نہیں دوں گا۔" میں اسے روتا چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

کاش میں تمہارے قابل ہوتا۔ کاش میں تمہارے جتنا اچھا ہوتا تو کبھی تمہیں رونے نہ دیتا۔ نفرتوں کے زہر سے میرا بدن نیلا پڑ چکا ہے۔ محبت اب مجھے راس نہیں آئے گی۔ کیا کروں کہ میں تیمور سجاد نہیں صہیب ریاض ہوں اور تم نے تو تیمور سجاد سے محبت کی ہے نا، جو بہت اچھا ہے، تم کبھی صہیب ریاض کو دیکھو۔ نفرتوں نے جسے محبت کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ جو سر سے لے کر پاؤں تک گناہوں میں اٹا ہوا ہے۔

مجھے معاف کر دینا ہانیہ محمود! مگر اب ان نفرتوں کے بنا میں جی نہیں سکتا۔

ابن آدم پھر جنت سے نکل کر منافقت، جھوٹ اور مکر و فریب سے بھری دنیا میں آگیا تھا۔ جہاں محبتوں کے دریا بہتے تھے، جہاں کا آسمان خلوص سے بھرا اور زمین چاہتوں سے لبریز تھی وہ جنت ابن آدم کو راس نہیں آئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

سٹنی بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی تیز رفتار زندگی، وہی بھاگتے دوڑتے مصروف لوگ، وہی قدرتی حسن سے مالا مال سرزمین سب کچھ ویسا ہی تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

آج کل میں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے تو یہ کوئی ایسی تشویش کی بات تو نہیں۔ نہیں دل چاہتا میرا۔ اگر لڑکیوں میں میری دلچسپی ختم ہو گئی تو کیا ہوا۔ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں جس پر حیران ہوا جائے۔

ولیم کے ہاں ڈنر پر ولیم نے ایک ٹرکش مسلمان لڑکی سے میرا تعارف کروایا جو بے حد خوب صورت تھی۔ میں صرف ہائے ہیلو کر کے وہاں سے ہٹ گیا تو ولیم آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اتنی خوب صورت لڑکی کو تم نے نظر انداز کر دیا۔ میں نے تو خاص طور پر تمہارا اس سے تعارف کروایا تھا۔"

لڑکیوں سے متعلق میری دلچسپی سے میرے تمام ہی دوست آگاہ تھے اور اکثر ہم آپس میں بیٹھ کر ان لڑکیوں کو ڈسکس کیا کرتے ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ میرے دوست مجھ پر رشک کیا کرتے تھے کہ مجھ میں ایسی کیا مقناطیسیت ہے کہ ہر لڑکی میری طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ بزنس میں میرے اپنے جو اصول تھے ان سب میں تبدیلی آ رہی تھی۔ مجھے محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر میرے آس پاس رہنے والے اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مارک ایک روز مجھ سے الجھ پڑا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو صہیب! یاد کرو تم ہی کہا کرتے تھے کہ بزنس میں صرف اپنا فائدہ دیکھا جاتا ہے۔ بزنس میں ایمانداری، اصول اور سچائی کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔"

اسے میرے کئی فیصلوں سے اختلاف تھا۔ اس کو لگتا تھا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں اپنے بزنس کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہوں۔ میں نے اس کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

"جو مجھے صحیح لگے گا میں وہی کروں گا۔ تمہیں اعتراض ہے تو تم خوشی سے الگ ہو سکتے ہو۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

میں کاک ٹیلز اور ڈانس پارٹیز میں شرکت کے مقابلے میں تنہا رہنے کو ترجیح دینے لگا تھا۔ آفس کے بعد کا سارا وقت گھر پر گزارتا یا پھر لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا۔ صبح سو کر اٹھتا تو اپنے گھر کا وسیع و عریض لان مجھے ایکدم بکواس لگتا۔ آنکھوں کے سامنے ایکدم کوئی آہستہ آہستہ گھاس پر پاؤں رکھتا نظر آنے لگتا۔ کانوں میں کسی کی بڑی پیاری اور میٹھی قرات کی آواز گونجنے لگتی۔ میں کوئی بات یاد نہیں کرنا چاہتا تھا اس جادو نگری کی ہر یاد کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اپنا دھیان فوراً کسی اور طرف لگانے کی کوشش کرتا

ضائع کر دیتا۔ مگر جتنا بچنے کی کوشش کرتا وہ طلسم کدہ اتنا ہی یاد آتا۔ رات کو سوتے سے اٹھ کر بیٹھ جایا کرتا۔ اس کی روتی ہوئی آواز میرے آس پاس بکھر جاتی۔ خود کو کمزور پڑتا دیکھ کر اپنے آپ سے لڑنے لگتا۔

دسمبر کا مہینہ ہر سال میرے لیے قیامت کا مہینہ ہوتا تھا۔ خصوصاً ستائیس دسمبر کی رات تو مجھے پاگل کر دیا کرتی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک میں ہر سال کرسمس کی چھٹیاں ساری دنیا سے کٹ کر اپنے گھر میں مقید ہو کر گزارا کرتا تھا۔ میرے سینے میں ایک آگ جلتی تھی اور اس آگ میں جتنا میرا وجود نفرت کی انتہا گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ رات میں شراب کے نشے میں غرق ہو کر گزارا کرتا تھا۔ نہ ہوش و حواس میں ہوں گا اور نہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کا احساس میرے اندر بیدار ہو گا اور پچھلے چار سالوں سے تو میں کرسمس کی چھٹیاں اٹلی میں گزارنے لگا تھا۔

اسی جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر خود سے کہا کرتا تھا "معاف وہ کرتا ہے جو کچھ کر نہیں سکتا جو انتقام لینا جانتا ہے اس کے پاس معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہیں اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا ہے۔" اب کے جب دسمبر آیا تو میری وہ کیفیت نہیں تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ بے شک اس مہینے نے مجھے اداس کر دیا تھا مگر میرے اوپر کوئی جنونی کیفیت سوار نہیں ہوئی تھی۔ کرسمس کی چھٹیاں میں نے گھر میں ہی گزار دی تھیں مگر شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ہاں ستائیس تاریخ کو میرا دل بڑا بے چین اور مضطرب سا تھا۔ ماضی کی ایک ایک بات مجھے یاد آ رہی تھی، وہ یادیں مجھے رلا رہی تھیں میں تڑپ رہا تھا۔ اپنے اضطراب کو کم کرنے کے لیے میں ساری رات اللہ کے حضور رو رو کر دعائیں مانگتا رہا تھا۔

"یا اللہ مجھے صبر دے دے، مجھے جو بے سکونی لاحق ہے اسے ختم کر دے۔ جو کچھ میری تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا میں اسے بدلنے پر قادر نہیں۔ میں تیری رضا میں راضی رہوں مجھے ایسا کر دے۔" میں روتے روتے سو گیا تھا۔ صبح اٹھا تو دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میرا دل بالکل ہلکا پھلکا اور مطمئن تھا۔

میں اتنے عرصے سے خود سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ مگر آج میں خود سے صرف سچ سننا چاہتا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ وہ صہیب ریاض جو ایک خود غرض انسان تھا، جو مغروریت اور فرعونیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، جو انسانوں کو چیزوں کی طرح استعمال کرتا تھا، جو اپنے لیے ہر ناجائز بات کو بھی جائز سمجھتا تھا، جو تقدیر کو نہیں مانتا تھا جو معاف کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ صہیب ریاض تو اسی روز مر گیا تھا جب ایک گلابی آنچل اس کے کمرے کی دہلیز پر گرا تھا۔

صہیب ریاض کو تو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ وہاں سے جو چلا تھا، وہ تو تیمور سجاد تھا۔ جس نے زندگی میں کبھی کوئی برا کام نہیں کیا تھا۔ جو بہت اچھا تھا۔ جو صرف محبت کرنا جانتا تھا۔

جزا اور سزا اپنے ہاتھ میں لینے والا وہ کون تھا۔ زندگی اور موت کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ ہر انتقام سے آزاد ہو گیا تھا۔ واقعی محبت اور نفرت کسی دل میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی اور صہیب ریاض کی موت کے ساتھ ہی اس کی تمام نفرتیں بھی مر گئی تھیں۔ اب تو سینے میں صرف ایک محبت بھرا دل دھڑک رہا تھا۔ جو اپنے پرائے سب کے غم پر ایک سا دکھ محسوس کرتا تھا۔

میں شہلا عثمان کو جان سے مار دوں، اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں یا اس کی لاش گدھ کے سامنے ڈال دوں تب بھی اس کا بیٹا کہلاؤں گا۔ یہ کڑوی سچائی مجھے ہر قیمت پر تسلیم کرنی پڑے گی کہ میں نے ایک بدکردار عورت کی کوکھ سے جنم لیا۔ میں مر بھی جاؤں تو یہ سچائی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور اگر یہی سچائی ہے تو مجھے اسے ماننا پڑے گا۔ کیونکہ میرے نہ ماننے سے سچائی بدل تو نہیں جائے گی۔

اوہ میرے خدا! اتنی سی بات سمجھنے میں، میں نے اپنی عمر کے بتیس سال گنوا دیے۔ بائیس سال تک

ایک ایسی بات پر جو میری تقدیر میں لکھ دی گئی تھی اور جسے میں بدل نہیں سکتا تھا خود کو اذیتیں دیتا رہا۔ کتنے دنوں سے کھیلا' کتنی آہیں سمیٹیں' کتنوں کو دکھ دیا۔ یہ زندگی تو محبت کرنے کے لیے بہت تھوڑی سی ہے ہم اس میں نفرت کرنے کا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں۔ کتنی ہے انسان کی زندگی ساٹھ سال' ستر سال بہت سے' بہت سو سال بس اتنی سی زندگی اور اس میں انسان نفرتیں پالتا ہے۔ دلوں میں کدورتیں رکھی جاتی ہیں' ایک دوسرے سے حسد کیا جاتا ہے' ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ مجھے تو اگر سو زندگیاں بھی اور ملیں تو میں انہیں محبتوں کے ساتھ گزارنا چاہوں گا۔ اپنی اسی جنت میں۔

"میری جنت۔" میں نے خود سے کہا۔ "کیا اب وہاں میری جگہ ہوگی کیا وہ لوگ مجھے معاف کر دیں گے۔ کیا وہ لڑکی ابھی بھی میری منتظر ہوگی کیا وہ میری محبت کا یقین کر لے گی۔"

"ہاں تم نے اپنے گناہوں کی بہت سزا پالی جاؤ اب اپنی جنت میں۔" میرے اندر سے آواز آئی تھی "اور سنو وہ یقیناً" تمہیں معاف کر دے گی کیونکہ محبت سمندر کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا دل سمندر جتنا بڑا اور ظرف سمندر کی طرح گہرا ہوتا ہے۔"

♥ ♡ ♡ ♥

پھپھو کو دوا کھلا کر سلانے کے بعد وہ لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ان دنوں وہ کچھ بیمار رہنے لگی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی گلاس ڈور سے باہر برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت اس نے دور سے ایک آدمی کو تیز تیز قدموں سے چل کر اس طرف آتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ ڈر گئی۔ خان لالہ کے ہوتے گھر میں کون گھس آیا۔ وہ ملگجے براؤن رنگ کا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے کے آگے تانے خود کو بارش سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا وہ تیز تیز چلا آرہا تھا۔

"تیمور۔" اچانک اس کے دل سے آواز نکلی تھی۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوئی تھی۔ بھاگتے ہوئے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ بغیر سردی اور بارش کی پروا کیے۔ تیمور نے اسے نکلتے دیکھ لیا تھا اور خود بھی بھاگتا ہوا اس تک آگیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ پورے ایک سال بعد۔

"ہانیہ! میں بہت طویل مسافت طے کر کے آیا ہوں۔ کیا مجھے میری جنت واپس مل جائے گی؟" اس کے سوال میں کئی امیدیں تھیں' کئی اندیشے تھے۔

"دیکھو مجھے مایوس مت کرنا میں اس صہیب کو نہیں شیطان صفت تمہارا تیمور آیا ہوں۔ تمہارے سامنے اس وقت تیمور کھڑا ہے۔ تمہارا تیمور۔ وہ تیمور جس سے تم نے محبت کی تھی۔" وہ بڑی آس سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ جواب میں اس کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے بولی تھی۔

"اتنی دیر کیوں کی آنے میں' میں کتنی اکیلی ہو گئی تھی۔" اور وہ اس کے جواب پر ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔

سارے اندیشے' سارے خدشے ختم ہو گئے تھے۔ اس کے لبوں پر کتنے عرصے بعد بڑی دلفریب سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"دیر کہاں ہوئی ہے۔ ہم دونوں ویسے ہی ہیں' ہماری جنت ویسی ہی ہے اور محبت ہمارے ساتھ ہے۔" وہ اس کے اشک صاف کرتا ہوا بولا۔ "اور سنو ہانیہ محبت کبھی نہیں ہارتی۔"

وہ بڑے پر یقین لہجے میں بولا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کوئی زنجیر ہو
آہن کی' چاندنی کی' روایت کی
محبت توڑ سکتی ہے
یہ ایسی ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا سکہ نہیں چلتا
اگر چشم تماشا میں ذرا سی ملاوٹ ہو
یہ آئینہ نہیں چلتا
یہ ایسی آگ ہے جس میں

کوئی زنجیر ہو
آہن کی' چاندنی کی' روایت کی
محبت توڑ سکتی ہے
یہ ایسی ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا سکہ نہیں چلتا
اگر چشم تماشا میں ذرا سی ملاوٹ ہو
یہ آئینہ نہیں چلتا
یہ ایسی آگ ہے جس میں
بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو روحیں مسکراتی ہیں
یہ وہ سیلاب ہے جس کو
دلوں کی بستیاں تو از دے کر خود بلاتی ہیں
یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے
جو منظر بجھ چکے ہیں ان کو بھی تنویر مل جائے
دعا جو بے نوا کا تھی اسے تاثیر مل جائے
کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے
محبت روک سکتی ہے کسی گرتے ستارے کو
یہ چکنا چور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہے یہ باگیں موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

محبت دلوں کی ملکہ ہے اور میرے دل کی سلطنت پر جب اس ملکہ نے بڑے طمطراق سے قدم رکھا تو نخوت سے بولی تھی۔

"جہاں میں رہتی ہوں' وہاں کوئی اور نہیں رہ سکتا۔" اور پھر اس مغرور ملکہ نے میرے دل سے تمام نفرتیں اکھیل پھینکی تھیں۔

آج میرے لیے میرے ماضی کی ہر بات صرف ایک تلخ یاد ہے۔ اب یہ یادیں مجھے پاگل نہیں کرتیں' میرے اندر کوئی شیطان بیدار نہیں ہوتا' کوئی فرعون نہیں جاگتا۔ انتقام کی کوئی آگ میرے اندر نہیں جلتی۔ اس لیے کہ محبت میرے ساتھ ہے۔ یہ بڑے پیار سے میرے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے کہتی ہے "اداس مت ہونا میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اور جس کے ساتھ محبت ہو اسے کسی بات کی کیا فکر۔ کتنا غلط کہتا تھا میں کہ محبت انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے۔ محبت تو انسان کو بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ اسے صبر کرنا اور معاف کر دینا سکھاتی ہے اور جو لوگ صبر کرتے ہیں اور بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کر دیتے ہیں' وہ بزدل تو نہیں ہوتے' وہ تو بہت عالی ہمت ہوتے ہیں۔ محبت عام سے انسان کو بہت خاص بنا دیتی ہے۔ یہ انسان کو بہت اچھا بنا دیتی ہے۔ اس میں فرشتوں کی سی صفات پیدا کر دیتی ہے۔ محبت اگر انسان کو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے تو اس میں انسان خوش خوش موت کو بھی بڑی بہادری سے گلے لگا لیتا ہے۔

محبت ساگر جیسی ہوتی ہے۔ اسی کی طرح بے کراں اور لامحدود' اپنے اندر کئی انمول خزانے چھپائے ہوئے۔ یقین کریں محبت بہت خوب صورت ہے اور یہ جس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اس کو بھی اپنی طرح خوب صورت بنا دیتی ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ
خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا
شائع ہو گیا ہے
خوبصورت سرورق، آفسٹ چھپائی، مضبوط جلد،
قیمت 600 روپے
پتا ذیل سے خریدیں
• مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی
• احمد نیوز ایجنسی، فریئر مارکیٹ کراچی
• سلطان نیوز ایجنسی، انارکلی مارکیٹ لاہور
• اشرف بک ایجنسی راولپنڈی • میران نیوز ایجنسی حیدرآباد
بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتا مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی